علامہ عبدالوہاب شعرانی

صفیہ اکیڈمی ۱۴-۱/۲ پی آئی بی کالونی کراچی ۵

برائے تنقید و تبصرہ ۔ ہفت روزہ چٹان لاہور

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ

الحمد للہ علی احسانہ کہ کتاب مستطاب جامع آثار اذکیاء و اولیاء و ہادی المدرجات رفیع و علیا

اعنی اردو ترجمہ

اَنْوَارُ الْقُدْسِيَّة
فِي
آدَابِ الْعُبُودِيَّة

از تالیفات سراج السالکین قدوۃ الفقہاء والمحدثین غوث صمدانی

قطب ربانی امام عبد الوہاب شعرانی نور اللہ مرقدہ و جعل الجنۃ مثواہ

ملنے کا پتہ

صفیہ اکیڈمی ۲/۱۴ پی آئی بی کالونی کراچی ۵
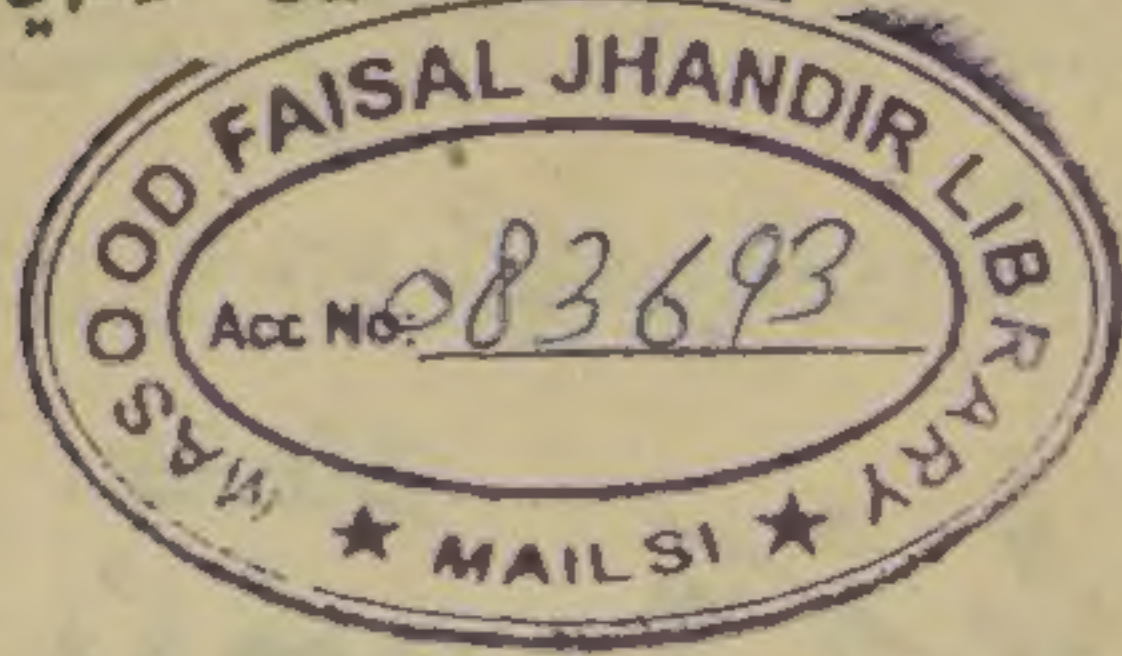
فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۔	دیباچہ	۵
۲۔	باب اول۔ مطلقاً آداب عبودیت کے بیان میں	۱۴
۳۔	باب دوم۔ علم نافع کے تلاش کے بیان میں	۳۵
۴۔	باب سوم۔ سلف کے فقراء و مشائخ صلحاء کے حالات میں	۸۹
۵۔	فصل۔	۱۷۰
۶۔	خاتمہ عبودیت کے بیان میں جس کے سامنے سالکوں کے تمام مراتب و مقامات ہیچ ہیں	۱۷۸
۷۔	قطعہ تاریخ	۲۳۰

اچھی کتابوں کے مطالعہ سے

انسان

اچھے دوست مہیا کرتا ہے

آپ ہمیشہ اپنے

مطالعہ کے لئے اچھی کتابیں خریدا

کریں

ناشر

بھلا جس کی شان بیرون از عقل و قیاس و گمان و وہم ہو اس کی حمد و ثنا کا دم مارنا چھوٹا منہ بڑی بات نہیں ہے تو کیا ہے؟ اور اس کے رسول مقبول (جس کی تعریف بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ ہو) کی نعت کا حوصلہ کرنا ان کے شان کے معاملہ میں ایک گونہ گوں جرارت و بیباکی نہیں ہے تو کیا ہے؟ غرض اصل مطلب ہے کہ ایک دن جب کہ پیر کا روز ستر ہویں رجب ۱۳۱۹ھ تھا میرے دل میں آیا اور نہایت جذبہ دل دامنگیر ہوا کہ اولیاءؒ کے مقامات و مراتب و مدارج د سالک سے واقفیت حاصل کرنی چاہئیے۔ جو کچھ میں نے حاصل کیا ہوا تھا وہ مجھے حقیر معلوم ہوتا تھا اور اس درجہ و مقام پر خوش نہیں تھا۔ بلکہ مدارج عالیہ و منازل رفیعہ پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ اس ناشکری سے کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا کے غضب و مقت کے نرغے میں پھنس جاؤں اور کہیں دور ناتحہ کی نوبت نہ پہنچ جائے۔ غرض کہ اس خیال میں غلطاں و پیچاں ہو کر باہر نکلا۔ اور مصر کے ایک روضہ کے سامنے مقام قسطاطہ میں مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی۔ کہ میں نے نوم (نیند) ویقظہ (بیداری) کی حالت میں ایک ہاتف (آواز دینے والا) کی آواز سنی جس کا جسم مجھے نظر نہیں آتا تھا) اور وہ اللہ تعالیٰ

کی زبان سے کہہ رہا تھا کہ اے میرے بندے اگر میں تجھ کو تمام کائنات و جمیع مخلوقات اور ہر ذرہ ریگ اور ہر قطرۂ دریا اور ہر ایک قسم کے نباتات اور ان کے اسمار اور ان کی اعمار (عمریں) اور تمام حیوانات اور ان کے اعمار اور تمام طیور و وحوش و حشرات وغیرہ پر مطلع کر دوں اور آسمانوں اور زمینوں و جنت و نار کی حقیقت ظاہری و باطنی تجھ پر منکشف کر دوں اور تیری دعا سے بادل برساؤں اور تیرے ہاتھ پر مردے زندہ کر دوں اور تمام اقسام کے کرامات تیرے ہاتھ سے ظاہر ہونے لگیں۔ تو بھی یہ تمام چیزیں اور یہ سب فضائل و مراتب درجہ عبودیت کے سامنے ہیچ ہیں اور سب سے اعلیٰ و اکمل درجہ عبودیت کا ہے" جب یہ کلام میرے کان میں پڑا تو میرے دل سے مدارج و مراتب اولیار کی خواہش و ہوس کا فور ہو گئی۔ اور دنیا و آخرت کی آرزوئیں اور ان کے حصول کی خواہشیں یک قلم موقوف ہو گئیں۔ میں خدا کی اس نعمت کا شکر بجالایا اور خیال سابق سے روگردانی کر کے اس طرف متوجہ ہوا کہ عبودیت کیا چیز ہے جس کی اس قدر عظمت ہاتف کے کلام سے معلوم ہوئی ہے۔ اور ہاتف کے کلام اور القار سے کیا مراد ہے اور چاہا کہ حقیقت عبودیت کو مفصل و مشرح بیان کیا جاوے اور اس کو عارفوں و کاملوں کے اقوال سے مرصع (جڑاؤ) و مسجع (زیب دار) بنایا جاوے اور ساتھ ہی یہ خوف تھا کہ کوئی جاہل ناحق شناس عرفان سے خالی یہ نہ سمجھ بیٹھے۔ کہ میں نبوت کا مدعی ہوں اور اس کو انبیار کی وحی خیال کرتا ہوں۔ حاشا و کلا

اب جاننا چاہیئے کہ ہاتف مذکور یا فرشتہ ہو گا یا کوئی ولی یا صالح جن یا خضر علیہ السلام یا کوئی اور مرد خدا۔ خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور ان سے اور مہدی علیہ السلام امام آخر زماں سے ہمارے شیخ عارف حسن عراقی (جن

کی قبر مصر کے برکہ رطل کے نزدیک مقام کوم کے اوپر واقع ہے) کی ملاقات ہوئی تھی ۔ اور انہوں نے ہر دو بزرگان سے قوم کی ہدایت کا رستہ سیکھا تھا میرے شیخ نے ذکر کیا کہ میں مہدیؑ امام آخر زماں سے دمشق میں ملا اور سات روز ان کے ہاں قیام کیا ان کا قاعدہ تھا کہ ہر رات پانچ سو رکعت پڑھتے اور ہمیشہ روزہ رکھتے ۔ اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات بیان کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "میں نے امام سے ان کی عمر دریافت کی تو فرمایا کہ دوسری صدی ہجری کے اخیر میں پیدا ہوا تھا ۔ پھر میں نے اس معاملہ کو بعض کامل عارفوں سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی اسی تاریخ کا حوالہ دیا ۔

ہاتف کے القار کی حقیقت یہ ہے کہ وحی کے کئی اقسام ہیں ۔

(۱) جو خیالی القار و الہام ہوتا ہے ۔ جیسا کہ عالم خیال میں مبشرات (خوش خبریاں نیک امور) کا ظہور ہوتا ہے اور یہ نیند کی وحی کہلاتی ہے ۔ گویا القار شدہ چیز اور اتارنیوالا و وحی سب خیال کا نمونہ ہوتے ہیں ۔

(۲) وہ وحی ہے جو صاحب حس پر حس میں ایک خیال معلوم ہوتا ہے ۔

(۳) وہ وحی جو ایک قسم کا معنے و کیفیت ہوتی ہے ۔ جس کو وہ شخص اپنے دل میں بغیر تعلق حس کے اور بغیر لحاظ اتارنیوالے کے موجود پاتا ہے ۔ اس کا نام الہام ہے ۔ اور گاہ، وہ مضمون لکھا ہوا پاتا ہے ۔ اور یہ نظارہ اکثر اولیاء کاملین کو ہوتا رہتا ہے ۔ ہمارے شیخ کی یہ کیفیت ہوتی کہ اکثر اوقات جاگنے کے بعد اپنے پاس کاغذ پڑا پاتے جس میں القار و الہام خداوندی لکھا ہوتا ۔ جب یہ بات معلوم ہوچکی تو اب یہ جاننا چاہیئے کہ کامل عارفوں اور اعلیٰ عابدوں کے دلوں پر ارواح ۔ علوم غیب کو اتارتے ہیں ۔ جو عارف کامل ان ارواح کو پہچانتا ہے ۔ ان سے

بڑے ادب و تپاک سے ملتا ہے اور جو لوگ ایسے ہیں کہ ان پر ارواح نازل ہوتے ہیں مگر وہ ان کو پہچانتے نہیں تو ان سے علم غیب تو لے لیتے ہیں اور اور یہ نہیں جانتے کہ کس سے لیا گیا ہے جیسا کہ کاہن و جوگی ہوتے ہیں۔ یعنی اہل اللہ ارواح کے نزول کو اپنے دل پر دیکھتے ہیں اور فرشتوں کے نزول کو نہیں دیکھتے کیوں کہ فرشتوں کے نزول کا نظارہ انبیاء و رسل سے مخصوص ہے۔ گویا اہل اللہ کو صرف القاء ہوتا ہے اور رؤیت (آنکھوں سے دیکھنا) نہیں ہوتی۔ اور انبیاء و رسل القاء و رؤیت ہر دو سے مشرف ہوتے۔ اور یہی امر نبی و ولی میں فارق (فرق کرنیوالا) ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو کچھ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر القاء ہوتا ہے وہ لفظ وحی و شرع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ الفاظ صفت کے اعتبار سے خدا کی طرف منسوب ہوں تو انہیں قرآن و فرقان و توراۃ و انجیل و صحائف کہا جاتا ہے۔ اور اگر فعل کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوں تو ان کا نام حدیث وغیرہ سنت رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ الفاظ منزلہ شرعیہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ لیکن ان علوم کی حقیقت و معارف و دقائق کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ یہ حقائق وقتاً فوقتاً کامل عارفوں کے دل پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ دروازہ تا قیام قیامت کھلا رہے گا تاکہ ہر زمانے میں ان کے ذریعہ سے صاحب استعدادوں کو فائدہ پہنچتا رہے۔ اولیاء کا کام صرف یہی ہے کہ جو شخص ہدایت کی درخواست کرے اس کی حسب استعداد اسے ہدایت کا راستہ دکھاویں اور ابتداءً کسی کو نہ چھیڑیں۔ اور اپنے خیالات کی طرف نہ بلاویں ابتداءً دعوت کرنا اور لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف بلانا اور لوگوں میں انگشت نما بننا اور کھلم کھلا لوگوں کو خدا کی طرف بلانا اور مناظرے و مباحثے کرنا انبیاء کا

کام ہے۔ ولی کی دعوت بالذات وابتداءً نہیں ہوتی بلکہ اس کی دعوت رسول کی دعوت کے تابع ہوتی ہے۔ اور وہ رسول کی زبان سے پکارتا ہے نہ اپنی زبان سے۔ اسی واسطے اگر کوئی ولی رسول کے حکم کی مخالفت کرے تو اس کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ولی ایسا کرے تو سمجھنا چاہیئے کہ اسے علم الیقین حاصل نہیں ہوا۔ اور اس کو وہ بصیرت و واقفیت جو شرائط ولایت سے ہے حاصل نہیں ہوئی۔ جب یہ قاعدہ مرکوز خاطر ہو چکا تو اس فقیر کے القاء میں جو ہاتف کی طرف سے ہوا کسی قسم کا دعویٰ نبوت بلکہ کامل عارفوں کے رتبہ کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس فقیر نے القاء کنندہ کی صورت کو نہیں دیکھا اور نہ یہ واقعہ بیداری میں ہوا۔ نہ اس کا تعلق احکام شرعیہ سے ہے۔ پس تمام شرائط جو خاصۂ نبوت ہیں مفقود ہیں تو پھر کیونکہ یہ وہم ہو سکتا ہے۔ کہ یہ فقیر مدعیٔ نبوت ہوگا۔ جب القاء ہو چکا تو میرے ایک صادق باوفا دوست نے درخواست کی کہ اس القاء کے متعلق وہ حالات جو اس سے علاقہ رکھتے ہیں۔ تحریر میں لاؤں۔ اس واسطے اس کی درخواست کو منظور کر کے وہ آداب وغیرہا جو عبودیت و طلب علم نافع و فقر و ولایت سے تعلق رکھتے ہیں لکھنے کا ارادہ کیا ہے کے علاوہ وہ وساوس و خدشات نفس بھی جو سالک کو راہ سلوک میں اور طالب علم کو طریق طلب میں اور عابد کو راہ عبودیت میں شیطان کی طرف سے پیش آیا کرتے ہیں۔ تحریر کئے جاویں گے اور خاتمہ میں ان مدعیین کے کچھ حالات درج ہوں گے جو مقام عبودیت سے گرے ہوئے ہوتے ہیں پس درجہ عبودیت تو انبیاء و صدیقین کا ایک خاص مرتبہ ہے اور میں نے اس رسالہ کا نام (الانوار القدسیۃ فی آداب العبودیۃ) رکھا۔ اور یہ بھی ہاتف کی زبان سے سبب کہ خطیب جمعہ کے روز منبر پر تھا۔ اللہ تعالیٰ سے یہ امید ہے کہ جو فقیہ صاحب دل

صاحب ذوق طالب عرفاں اس کا مطالعہ کرے گا۔ تو اسے عبودیت کے آداب اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی سے کافی آگاہی ہو جائے گی کیونکہ اس میں مشیخت و بزرگی کے ناموس کو توڑا گیا ہے اور ریا و تکبر جو اکثر طالبوں کو اس راستہ میں دامنگیر ہوتا ہے اس کی قلعی کھولی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ جو شیخ اپنی بزرگی جتلاتا ہے اور اخلاق رذیلہ سے اس کا باطن صاف نہیں ہوا ہے اس کے حق میں یہ دزدیدہ الفاظ زہر ہلاہل ہیں۔ اس کے حق میں تو یہ بہتر تھا کہ وہ انگشت نما نہ ہوتا بلکہ مستور و محجوب رہتا کیونکہ دنیا میں انبیاء و کامل عارفوں کے سوا جو شخص گمنام و مستور ہو وہی اچھا ہے اور جو لوگ سوائے دو گروہ مذکورہ کے اپنے ہم جنسوں پر امتیاز و عزت کے طالب ہوتے ہیں وہ محض جھوٹے مدعی اور کوچہ معرفت سے محض ناآشنا ہوتے ہیں۔ بعض مدعی محض کہ دن عرفت اور اذکار و دزدیدہ الفاظ کو ہی معرفت نامہ و ولایت کا ملہ خیال کئے بیٹھے ہیں اور شیطان کے دھوکے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ریا کیا چیز ہے اور اخلاق حمیدہ کی کیا علامات ہیں اور اخلاق رذیلہ کیا اوصاف ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لوگوں کو فلاح و صلاح پہنچانے کے خیال سے ساری عمر ان کو اعمال شاقہ[1] (مشکل کام) میں لگائے رکھتے ہیں اور ان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ فقیر عارف کامل کو ایک تختہ بھی ان کی صحبت میں کاٹنا قیامت کا سامنا ہو جاتا ہے۔ اور ہمارے اس زمانے کے اکثر فقیر اسی قسم سے ہیں۔ اور ان میں سے سوائے معدودے چند کے کوئی بھی ریا و تصنع و تکلف سے خالی نہیں ہے اور کوئی بھی ان میں سے ایک کوڑی

---

[1] جیسے چلہ۔ یوگ۔ حبس دم وغیرہ

بھی تصدق نہیں کرتا بلکہ جہاں کچھ پاتے ہیں لپٹنے کی سوجھتی ہے۔ اور اس کو فخر خیال کرتے ہیں اور دولتمندوں کی تعریف کرتے ہیں۔ میرا ایک شیخ کہا کرتا تھا کہ امیر شیخ تو بڑا ڈھول ہے اور غریب شیخ ذلیل آدمی ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ فقیر عارف کے حق میں امتیاز کا چھوڑنا اور گمنام رہنا اور لوگوں میں مستور و محجوب ہونا بہتر ہے۔ بلکہ اصل صداقت یہی ہے اور یہی طریقہ صحابہ و تابعین کا تھا اور یہی طریقہ آسان ہے اور عام مسلمانوں کے واسطے مفید ہے کیونکہ تمام لوگ اس درجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور جو چیز خلاف حقیقت ہو اس کا دعویٰ انسان کے لئے زیبا نہیں۔ جیسا کہ الوہیت کا دعویٰ عاجز بندہ کے لئے شایاں نہیں۔

جاننا چاہیئے کہ بندہ کا اپنی حد سے تجاوز کرنے کا باعث یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالےٰ تمام صفات جلالیہ تکبر و بزرگی و عزت و عظمت و شوکت و جلالت سے موصوف ہے۔ اس کی صورت (انسان) میں بھی یہ امور ظلی طور پر سرایت کئے ہوئے ہیں لیکن عبد کامل و عارف صادق وہ ہوتا ہے۔ جو صفات عبودیت عجز و انکسار و تواضع و تکسر و افتقار و احتیاج سے موصوف ہو وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک عاجز بندہ ہوں۔ مجھے گرمی و سردی ستاتی ہے۔ ہر ایک چیز میری جان کی دشمن ہے۔ وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کو بھی حقیر نہیں سمجھتا بلکہ اپنے زر خرید غلام پر بھی فوقیت نہیں جتاتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ شاید وہ عند اللہ مجھ سے اچھا ہو۔ اور جو شخص اس کے برخلاف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات مخصوصہ سے متصف ہونا چاہتا ہے۔ وہ حقیقت میں جاہل مطلق اور غبی ہے اور نہیں سمجھتا کہ تکبر و کبریائی خدا کا خاصہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ متکبروں کو پسند نہیں کرتا اور نہیں جانتا کہ

وضیع و شریف و غلام و آقا سب خدا کی ملکیت ہیں کسی کو کسی پر بلحاظ خلقیت کوئی شرافت و فضیلت نہیں ہے۔ ہاں رسولوں کو بوجہ ماموریت و نزول وحی ہونے کے سبب پر فضیلت ہوتی ہے۔ مگر فقیر عارف کا کام تو یہی ہے کہ محض خدا کا بندہ ہو جاوے اور کسی کو نظر حقارت سے نہ دیکھے اور تکبر و ریا وغیرہ اخلاق رذیلہ سے کنارہ کرے اور اس طریقہ پر چلنے کے لئے کسی شیخ و پیر کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ عارف کامل و شیخ فاضل کی ضرورت صرف مکاشفہ و مجاہدہ وغیرہ امور خفیہ باطنیہ کے واسطے ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مراحل الفاظ کے سیکھنے سے طے نہیں ہو سکتے یہ راستہ چلنے کا ہے نہ کہنے کا۔ اور یہ باتیں مشق و ریاضت و طریق عمل سے حاصل ہوتی ہے جیسا شہد کا ذائقہ جاننے والا اس شخص کو جس نے کبھی شہد نہیں چکھا اس کا ذائقہ نہیں سمجھا سکتا۔ ایسا ہی عارف کامل اس شخص کو جس نے اس راستہ پر قدم نہیں رکھا۔ اور مشق و ریاضت کو کام میں نہیں لایا۔ معرفت کی لذت و عبودیت کے ذوق سے واقف نہیں کر سکتا۔ اس واسطے میں نے بھی اس رسالہ میں جو امور ذوق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو ترک کر دیا ہے کیونکہ دنیا میں مقلد بہت ہیں اور محقق کم۔ اور قاعدہ ہے کہ مقلد نہ سوچنے والا جب کسی خیال کو اپنے خیال کے مخالف پاتا ہے۔ تو اس کے انکار و تردید کی طرف دوڑتا ہے اگرچہ وہ خیال واقع کے مطابق ہی ہو۔ مگر صوفیوں کے نزدیک ایسا شخص معذور سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس ذوق و لذت سے محروم و بے خبر ہوتا ہے۔ لیکن محقق کا یہ طریقہ ہے۔ کہ جب کسی خیال کو اپنے خیال کے مخالف پاتا ہے تو اسے سوچتا ہے اور تقلید و تعصب کے گڑھے میں گرنا نہیں چاہتا۔ وہ تقلید کو ادنے مرتبہ خیال کرتا ہے اور تحقیق سے مدارج عالیہ پر پہنچنا چاہتا ہے اور جانتا ہے کہ (شنیدہ کے بود مانند دیدہ) کا مقولہ

راست ہے۔ یہ دہ رکھنا چاہیئے کہ جو مضامین میں نے اس رسالہ میں بفضلہٖ
و بتوفیق اللہ کے ارادہ سے درج کئے ہیں وہ چنداں زیادہ غور و فکر و دقتِ نظر کا
نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک حبیبِ صادق کی درخواست کا نتیجہ ہیں۔ اس واسطے
التجا ہے کہ اگر کوئی مناسب صاحبِ ذہن و ذکا و مالکِ حسنِ بیان اس میں کوئی
مضمون خلافِ کتاب ملاحظہ کرے۔ تو بشرطِ علم الیقین درستی اس کی اصلاح
کر دے۔ اور اس فقیر کے حق میں دعائے مغفرت کرے اور دعائے خیر سے یاد
کرے۔

یہ رسالہ تین باب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ باب اول مطلق آداب
عبودیت میں۔ باب ثانی مفید و نافع علم کے طلب کے طریقوں میں۔ باب ثالث
فقراء و سالکین کے آداب میں۔ خاتمہ ان معاملات کے بیان میں جو عبد کامل
و عارف محقق کے نزدیک مقامِ عبودیت سے گرے ہوئے ہیں اور یہی عمدہ حصہ
رسالہ کا یہی ہے اور اس کی تالیف و تصنیف کا باعث بھی وہی ہے۔ اس باب
میں اللہ تعالیٰ کی اعانت سے وہ مضامین نفیسہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر
کئے ہیں۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے پہلے کسی نے ان کو نہیں لکھا ہے۔
تحریر کرتا ہوں۔ حقیقت میں رسالہ کی تصنیف و تالیف اسی وقت مفید و
قابلِ قدر ہو سکتی ہے کہ اس کے مضامین تازہ و دلفریب ہوں۔ ورنہ نقل بلا عقل
سے کیا فائدہ۔ اور میں نے اس رسالہ کی طرز تحریر کو اپنے ایک شیخ عارف
کی طرز پر رکھا ہے۔ انسان اتنا ہی بولتا ہے۔ جتنا اسے درگاہ الٰہی سے
عطا ہوتا ہے۔ اور علیم کل تو وہی پاک ذات ہے جس کی شان (سبحانک
لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العزیز الحکیم) ہے۔

باب اوّل مطلقاً آداب عبودیت کے بیان میں

اول یہ سمجھنا چاہیئے کہ کتب الہامیہ کے انزال اور رسل و انبیاء کے ارسال سے مقصود بالذات یہ ہے کہ خدا کی بندوں کو اپنی حقیقت اور اپنے خالق کی عظمت معلوم ہو جاوے اور وہ جان لیویں کہ ہماری پیدائش کی علت غائی کیا ہے۔ اور اپنے خالق کے حقوق میں تمیز کریں تاکہ اپنی حد سے تجاوز نہ کریں گویا کتب الٰہیہ خدا اور انسانوں کے مابین ایک قسم کا وثیقہ و عہد ہے جس میں کچھ حقوق خدا کے بندوں پر اور کچھ حقوق بندوں کے خدا پر درج ہیں۔ یعنی انسان اگر خدا کی شرائط مقررہ کو بجا لاوے گا۔ تو اللہ بھی اپنے فضل و کرم سے اس کا اجر مقرر و ثواب معین اسے ضرور دے گا۔ چنانچہ آیت ذیل (اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ) اس مضمون پر کمال وضاحت[1] سے دلالت کر رہی ہے۔ اور اس معاہدہ و مواعدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی اصلیت کو بھول گیا تھا۔ ورنہ اس معاہدہ کی کو ضرورت نہ ہوتی کیونکہ عبد مطلق (جس کا آقا پر کوئی حق نہیں ہوتا) کے ساتھ معاہدہ و مکاتبہ نہیں ہوا کرتا یہ معاملہ تو عبد مکاتب (جو غلام اپنے آقا سے آزادی کو طالب ہو) کے ساتھ ہوتا ہے جس میں آزادی و عدم فرمانبرداری کا شائبہ پایا جاتا ہے پس باعتبار

---

[1] تم میرے احکام کو بجا لاؤ۔ میں اپنے وعدہ کو پورا کر دوں گا۔

اطاعت خداوندی یہی حال انسان کا ہے۔ کہ انسان اپنی ذات عبودیت کو بھول گیا اور بذات خود ملک و تصرف کا دم بھرنے لگا۔ اور حلقۂ طاعت سے اپنی گردن کو باہر نکال کر آزاد کرنے لگا۔ تو اس کو آزاد و حر بنانے کے لئے ایسے معاہدہ و مکاتبت کی ضرورت ہے جس کی رو سے وہ اپنے شرائط مقررہ خداوندی کو پورا کر کے عذاب کو تکلیف کی رسی سے اپنی گردن چھڑا لے اور آزاد ہو جائے چونکہ معاہدہ طرفین سے ہوا کرتا ہے اسی واسطے خدا کو بھی اپنے وعدے و وعید پورا کرنے کے لئے انزال کتب و ارسال رسل کی ضرورت پڑی اگرچہ عام انسانوں کے لئے جو درجہ عبودیت پر نہیں پہنچے۔ یہ مواعید و مواثیق دل خوش کن ہیں۔ مگر عارف صادق اور عبد کامل کے دل پر (اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ) کا مضمون نہایت گراں گزرتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر بندہ عبودیت کے درجہ سے گرا ہوا نہ ہوتا تو یہ آیت نازل نہ ہوتی۔ اسی واسطے عارف ان مواعید کے اقرار کو ذریعہ حصول آزادی نہیں بناتے۔ بلکہ وہ تو عبد کامل ہونا چاہتے ہیں۔ اور اپنے کسی عمل کا اجر اپنے آقا سے نہیں مانگتے۔ بلکہ ہر ایک عمل اس کی رضامندی کے واسطے کرتے ہیں۔ نہ ثواب کی امید اور عذاب کے ڈر سے کیونکہ یہ کام عبد مکاتب کا ہے۔ نہ عبد مطلق کا اور وہ عبد مطلق ہونا چاہتے ہیں نہ عبد مکاتب۔ جب عبد مطلق کی یہ حقیقت ہوئی۔ تو ضرور ہے کہ اس کے آداب و علامات تحریر کئے جاویں تاکہ ان کی شناخت میں آسانی ہو جاوے پس عبد کامل کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے اوامر کو بجا لاوے اور منہیات سے پرہیز کرے صرف اس خیال سے کہ وہ اللہ کے احکام ہیں اور اپنے آقا کا حکم ماننا غلام کا فرض ہے نہ اس اعتبار سے کہ کرنے سے ثواب ہوگا اور نہ کرنے سے عذاب کیونکہ اس حالت میں آقا کی عظمت و مالک کی محبت کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ محض ٹکوں کی خاطر

کام کرتا ہے۔ اور سوائے اس مزدوری کے خدا سے کچھ اور پانے کا مستحق نہیں
ہوتا کیونکہ وہ تو اپنے نفس کی خاطر کام کرتا ہے نہ خدا کے واسطے علاوہ اس
کی ایسی عبادت نقصان و خلل و گستاخی سے خالی نہیں ہوتی۔ تو وہ ایسی
عبادت سے ثواب خاص کا مستحق کیونکر ہو سکتا ہے۔ بلکہ اخلاص نہ ہونے سے
غضب و نقمت کا مستحق ہو تو بجا ہے۔ اور اخلاص کی حالت میں بھی عدم قبولیت
کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ تو پھر طلب اجر کیونکر ہو سکتا ہے۔ ہاں یقینی معلوم
ہو جانے پر کہ قبول ہو گئی ہے۔ طلب اجرت کا امکان ہو سکتا ہے لیکن اس
صورت میں بھی گستاخی کا ڈر لگا ہوا ہے۔ کیونکہ اس وقت صورت سوال سے
معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے آقا کے وعدوں پر اعتبار نہیں ہے۔ یہ حالت
ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جو عبادت سے مغرور ہو جاتے ہیں اور دوسرے
لوگوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور جن میں تکبر و ریا کی مرض پھیل جاتی
ہے پھر وہ دوسروں کو جو ان کی سی عبادت نہیں کرتے لعنت و ملامت کرتے
ہیں حالانکہ خود حقیقت عبودیت سے ناواقف ہیں۔ مگر عوام کا حال (جو محض اللہ
کے ڈر سے سب کام کرتے ہیں اور اپنی عبادت کو دوسروں کے طعن کا ذریعہ
نہیں بناتے بلکہ خود کو حقیر و عاجز خیال کرتے ہیں) بہ نسبت ایسے متکبروں کے اچھا
ہے۔ پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ عبد کامل اپنے آقا کی خدمت کرنے سے
مزدوری کا طالب نہیں ہوتا بلکہ طلب اجرت کو بے ادبی و گستاخی سمجھتا ہے۔ وہ
تو صرف تعمیل حکم و انتشار امر کے واسطے کام کرتا ہے۔ اور اللہ خود اسے بغیر
مانگنے کے سب کچھ دیتا ہے۔ بلکہ عمل سے خود ہی اجرت مل جاتی ہے۔ اور
عامل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اسی واسطے رسولوں نے اپنی امتوں سے
کہا کہ ہم اس وعظ و نصیحت کا اجر تم سے نہیں مانگتے ہیں خود ہی اللہ اس کا

اجر دے دیگا۔ محمد رسول اللہ کو اس درجہ میں باقی انبیاء پر فضیلت ہے۔ کہ وہ اس اجر میں جو اللہ کے ذمہ ہوتا ہے سب انبیاء و رسل کے ساتھ شریک ہیں اور اس بات میں زیادہ ہیں کہ ان کی رسالت کا اجر ان کی امت پر بھی ہے اور وہ یہ کہ امت کے لوگ ان کے اہل بیت اور اہل قرابت سے بھی دوستی و محبت قلبی رکھیں۔ پس معلوم ہوا کہ خدمت و اجرت خالق و مخلوق کے درمیان دائر ہے۔ مخلوق کا اجر اللہ پر ہے اور اللہ کے احکام کی تعمیل خلقت پر لیکن اللہ پر جو اجر ہے وہ اس کی رحمت وعنایت ہے۔ اور اعمال صرف اس کی رحمت کے ظہور کا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ اگر مخلوق نہ ہوتی تو اس کی صفت رحمانیت کا مظہر ظہور میں نہ آتا۔ چونکہ اس راز کی تفصیل طویل ہے اس لئے بے استعدادوں کے خطاب کے لائق نہیں۔

جاننا چاہیئے کہ عبد کامل اجرت کے چھوڑنے سے اپنے آقا کی محبت و تقرب کا خواہاں ہوتا ہے۔ کیونکہ آقا جب اپنے بندے کو محبت و تعظیم سے عبادت و خدمت کرتے دیکھتا ہے۔ تو اسے اپنی رضامندی و خوشنودی کی خلعت پہناتا ہے۔ اور اس پر اس قسم کے احسان و اکرام کرتا ہے۔ جو کبھی اس کے خیال و ضمیر میں بھی نہیں آئے ہوتے۔ اور جو بندہ اس کی خدمت کسی غرض و نفع کے واسطے کرتا ہے آقا اسے مطلق العنان خیال کرتا ہے اور اسے اس کی اجرت تو دے دیتا ہے۔ مگر اس سے خوشنودی کا تعلق نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو ایک قسم کی گستاخی و بیباکی خیال کرتا ہے۔ یہ کیفیت بادشاہوں کے خادموں میں مشاہدہ ہوتی ہے کہ جو خادم محض محبت و خلوص نیت و حسن ارادت سے خدمت کرتا ہے اور بادشاہ سے کچھ نہیں مانگتا تو بادشاہ اسے بلا سوال جاگیریں وغیرہ عطا کر دیتا ہے۔ اور جو ملازم محض ٹکے کی خاطر خدمت بجا لاتا ہے تو بادشاہ کو اس کا حال معلوم ہو جانے پر اس کی خدمت و ملازمت بھی گوارا گذرتی ہے

اس نے اس کی خدمت و عبادت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔
اور سوائے مقررہ ٹکوں کے اور سب انعاموں سے ٹکے کا سا جواب لیتا ہے
اور عنایتوں سے محروم رہتا ہے۔ پس بندۂ حقیقی و عارف تحقیقی کا کام یہ ہے کہ وہ
اپنے آقا کے مواعید و مواثیق پر پورا بھروسہ رکھے اور کسی قسم کے شک و شبہ کو
دل میں جگہ نہ دے۔ کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر وثوق نہیں ہے وہ
ناقص الایمان ہے۔ اور وثوق کی علامت یہ ہے کہ اس کے نزدیک حالت
غیبت و حضور مساوی ہو اور اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جس کا ظاہر خلاف
شرع نہ ہو اور وہ صرف زبان سے اللہ تعالیٰ کے وعدوں کا انکار کرے
تو اس کو قتل از روئے شرع جائز ہے تو بھلا وہ شخص جس کا ظاہر و باطن ہر دو خلاف
شرع ہوں اور خباثت نفس اس کے دل میں مرکوز ہو وہ کیونکر مسلمان ہو سکتا
ہے۔ وہ حقیقت میں دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ کیونکہ اسلام تو تصدیق قلبی
کا نام ہے۔

لو اب سنو! کہ جو مرید کا ادنیٰ اور پہلا درجہ ہے وہ عالم فقیہ متقی کا اعلیٰ
درجہ ہے۔ کیونکہ فقیہ کا اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ اس کی عبادت و تلاوت کسی ثواب
کے حصول اور عذاب سے نجات کے واسطے نہ ہو اور مرید کو یہ سلوک کی پہلی
ہی منزل میں چھوڑنی پڑتی ہیں۔ اس کے بعد ترقی کے میدان میں قدم رکھتا اور اس
کے مدارج و مراتب کو درجہ بدرجہ طے کرتا ہوا ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے کہ
اسے اپنے نفس کا علم بھی نہیں رہتا اور اس پر اپنے آقا کی عظمت و جلالت کا
پردہ چھا جاتا ہے اور وہ اسی میں منہمک و مستغرق ہو جاتا ہے۔ اور اس کی یہ
حالت ہو جاتی ہے کہ باوجود آنکھیں کشادہ ہونے کے کچھ نہیں دیکھتا اور باوجود
کانوں کی سلامتی کے کچھ نہیں سنتا۔ وجہ یہ ہے کہ تمام اعضا و جوارح دل کے

تابع ہیں - تو جب دل یاد میں مصروف ہوتا ہے تو اعضا بھی اس کے پیچھے
جاتے ہیں - اور عالم محسوسات کو محسوس نہیں کرتے - فقہا کہا کرتے ہیں کہ عبادت
بلا غرض و غایت خواص کا مرتبہ ہے - درحقیقت وہ بیچارے سچ کہتے ہیں کیونکہ
انہوں نے ترقی کے میدان میں قدم نہیں رکھا ہوتا - اور ان کے نزدیک رسومات
ظاہریہ سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں ہوتا - اس واسطے نہ وہ آگے بڑھتے ہیں اور
نہ ان پر اسرار الٰہیہ منکشف ہوتے ہیں - مگر فقیر کمر ہمت باندھ کر ترقی کے میدان
میں چل پڑتا ہے - اور درجہ بدرجہ ترقی کے باغ کی بہار دیکھتا جاتا ہے - اور
جس حد تک پہنچتا ہے اس کو انتہا نہیں سمجھتا - جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے - توں
توں اس کے شکوک رفع ہوتے جاتے ہیں اور علم الیقین سے عین الیقین اور عین الیقین
سے حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے یہ رستہ عقل کی حد ختم ہونے سے شروع ہوتا ہے
پھر اس حد میں عقل پاؤں نہیں دھرتی - اس منزل میں مجاہدہ و مکاشفہ سے کام
نکلتا ہے نہ دلائل عقلیہ پر مدار ہے - حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا
کہ میں صوفیوں کے اس قول کی صداقت میں کہ (صوفی ترقی کرتے کرتے ایک
ایسے درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اگر اسے تلوار سے کاٹا جاوے تو وہ نہ کٹ سکے
اور اس کی ضرب اسے محسوس نہ ہو) دس سال متردد رہا یہاں تک کہ یہ حالت
منکشف ہو گئی - اور اس کی صداقت آئینہ ہو گئی - صاحب ذوق کا قول خالی
از ذوق کے نزدیک لائق یقین نہیں ہوا کرتا - اگر عوام الناس عارفوں کے اقوال
کی تصدیق کرتے ہیں تو یہ تقلیداً ہوتی ہے نہ تحقیقاً و ذوقاً - لیکن لذت وہی
پاتا ہے جس نے چکھا ہو -

میں جب اس رستہ میں داخل ہوا - تو میں نے اس حال کا ذائقہ اٹھایا اور
معلوم ہوا کہ لذت و ذوق اسی عبادت میں ہے [illegible] ہوتے ہو سب

ثواب و خوف عذاب اس کے سامنے ہیچ ہیں - اس سے پہلے یہ بات میرے ذہن نشین نہ ہوا کرتی تھی - اور کہا کرتا تھا - کہ جب طلب ثواب و خوف عذاب کوئی چیز نہیں - تو احادیث میں ترغیب عبادات و ترہیب محرمات کیوں ہے میں اسی غور و فکر میں تھا کہ ایک اور نبی ایک دوسرے عالم میں نظر آئے اور کہا کہ مخلوقات کے مختلف مدارج ہیں - اور چونکہ ہر ایک کی ہدایت مطلوب ہوتی ہے اس واسطے ان کی ہدایت کے اعتبار سے عبادت کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں - اور انبیاء کو ان کے عقل و فہم کے مطابق عبادات کے مراتب اور ثواب و عذاب، حلال و حرام کے مدارج بتلانے پڑتے ہیں - اور ہم کو ہر ایک قسم کی کلام امید و خوف و حکمت و اصل حقیقت کی کرنی پڑتی ہے - تاکہ ہر شخص اپنے اپنے حوصلہ و استعداد کے موافق اس سے فائدہ اٹھا سکے - جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رمز بتلائی - تو میرے شکوک رفع ہو گئے میں نے کہا کہ سبحان اللہ کہ آپ کیسے عمدہ معلم ہیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ جو شخص ابھی درجہ معرفت تک نہیں پہنچا اس کے لئے عبادت طلب ثواب و خوف عذاب سے ہی اچھی ہے - ورنہ اس حالت میں وہ نکات معرفت کے جاننے سے گمراہ ہو سکتا ہے -

دوسری علامت عبد کامل کی یہ ہے کہ ہر ایک حال میں (خواہ اچھا ہو یا برا) اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے اور جو کچھ نیکی یا بدی اس کی طرف سے آوے اس کو اپنے حق میں بہتر سمجھتا ہے - کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا آقا بہ نسبت میری - میرے خیر و شر کو خوب پہچانتا ہے - ممکن ہے کہ کسی چیز کو بندہ مکروہ خیال کرے حالانکہ وہی اس کے حق میں بہتر ہو - کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کامل ہے کسی کو اعلیٰ کسی کو ادنیٰ بنانا اس کی حکمت کا تقاضا ہے - جو اعلیٰ بنایا جاتا ہے -

وہ اسی کے قابل ہوتا ہے اور یہی اس کے حق میں اچھا ہوتا ہے۔ جو ادنیٰ ہوتا ہے وہ اسی کی قابلیت رکھتا ہے۔ اور وہی درجہ اس کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ حدیث قدسی سے یہی مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ خدا فرماتا ہے۔ کہ میرے بعض بندے فقر و احتیاج کے لائق ہیں اگر میں انہیں غنی کر دیتا تو ان کی حالت تباہ ہو جاتی۔ اور بعض بندوں کے حق میں غنا و دولت مندی ہی فائدہ رساں ہے۔ اگر انہیں فقیر و غریب کر دیتا۔ تو ان کا حال خراب ہو جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ جو شخص کسی وقت کسی درجہ میں ہے اس وقت وہی درجہ اس کے واسطے بہتر و مفید ہے اور وہی اس کے واسطے کمال ہے۔ پس انبیاء کے حق میں نبوت ہی کمال ہے اور ولیوں کے حق میں ولایت ہی مفید ہے۔ اور مومن مقلد کے واسطے ایمان تقلیدی ہی بہتر ہے اور عالم کے واسطے علم ہی خوب ہے۔ اور پیشہ ور کے لئے کوئی پیشہ و حرفت ہی اچھا ہے مگر اس کی حقیقت و اصلیت کو اہل اللہ ہی جانتے ہیں اور ان اسرار و حقائق کو عارفانِ کامل ہی پہچانتے ہیں۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی بندہ اپنی حالت موجودہ سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا چاہتا ہے۔ تو وہ خدا کے عطیہ کو پسند نہیں کرتا گویا در پردہ اس امر کا مدعی ہے کہ وہ اپنی مصلحت و بہتری بہ نسبت خدا کی اچھی سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال کفر و جہالت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تمام مضمون آیت ذیل (اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی)[1] سے بسہولت تمام غور کرنے والے کے نزدیک مستنبط ہو سکتا ہے۔ اس کی زیادہ تفصیل رجاء و رضا کے مقام پر آئیگی۔

تیسری علامت عارفوں کی یہ ہے کہ وہ ظاہر و باطن میں کسی کو سوائے خدا

---

[1] ہر ایک چیز کو پیدا کیا پھر اس کی فطرت کے موافق چلایا۔

کے کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتے اور اس اعتبار سے کہ کوئی چیز کسی کے ملک و قبضہ میں ہے۔ حقیقت میں اس کی ملک نہیں سمجھتے۔ حلال و حرام اس درجہ میں مساوی ہو جاتا ہے۔ غضب، دریا ان کے نزدیک اس حالت میں جائز و مباح ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم لیتے ہیں خواہ کسی طرح سے ہو اور جو کچھ ہم کھاتے ہیں خواہ کچھ ہی ہو ہمارے آقا اور مالک کا ہے۔ کسی طرف چند روز بباعث انتظام تمدن کے منسوب ہونے سے۔ اس کی ملک نہیں ہو جاتا۔ یہ مقام صاحب ذوق کا ہے نہ صاحب علم کا اسی واسطے فقیہ و فقیر کا اس امر میں جھگڑا ہوتا ہے۔ کہ فقیہ فقیر کو اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے اور جس طرح خود بوجہ عدم واقفیت و ذوق کے حلال و حرام کے دام میں پھنسا ہوا ہے۔ فقیر عارف کامل کو بھی اسی دام میں پیٹنا چاہتا ہے۔ وباوجود اعور (یک چشم) ہونے کے ہر دو آنکھوں والے کا معاملہ کرتا ہے۔ اگرچہ یہ فقیر بھی اس درجہ پر پہنچ گیا ہے۔ اور اس حال کا ذائقہ چکھا ہوا ہے۔ لیکن میں شریعت کی حرام کردہ اشیاء سے پرہیز کرتا ہوں پس کامل وہ ہے کہ سب اشیاء کو خدا کی ملکیت سمجھے اور بندوں کو مجازی مالک تصور کرے اور یہ خیال کرے کہ لوگوں کا مالک ہونا خدا ہی کے فضل و احسان سے ہے۔ اور دنیا کے انتظام و امن و اماں کا ذریعہ ہے۔ باعتبار حقیقت کے تو وہی مالک ہے۔ اور شریعت نے ہر ایک کو اپنی اپنی اشیاء مقبوضہ و مملوکہ کا حقدار بنایا ہے۔ اور غصب و سرقہ بغیر طریقہ شرعی کے حلال و جائز نہیں ہے۔ میرے شیخ ابوالحسن شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ تو اپنے ظاہر و باطن کو ملکیت کے دعوے سے پاک کر۔ کیونکہ جو بندہ ملک حقیقی کا دعوی کرتا ہے وہ مومن نہیں ہے۔ کیونکہ مومن وہ ہے جس کی جان و مال سب کچھ خدا کے لئے ہو۔ جیسا کہ خدا نے فرمایا (اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ) اور اس

ﮯ اللہ نے مومنوں کا جان و مال خرید لیا ہے۔

دعوے سے سلب ایمان کا خطرہ ہے۔ اور ادب یہی ہے کہ دعویٰ چھوڑ دے۔
ادب ہی ہر نیکی کا دروازہ ہے۔ اور کسی سے مجادلہ و مکابرہ نہ کر ہلاک ہو جائیگا۔

انسان کے دعویٰ ملکیت کا سبب ایک تو اس کا خلیفۃ اللہ ہونا دوسرا
خدا کا اس کے حق میں (وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) فرمانا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
انسان بھی مالک قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک چیز پر عبد کا اطلاق ہوتا ہے مگر
انسان پر مالک کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ چونکہ خدا باعتبار خالقیت کے ان کا
مالک حقیقی ہے۔ انسان بھی اس کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے چیزوں کا مالک کہلاتا
ہے۔ اگرچہ کوتاہ بینوں کے لئے یہ بات درست ہے اور خود کو کسی چیز کا
مالک تصور کرنا بجا ہے۔ مگر اہل حق عارفوں کے نزدیک دعویٰ ملکیت۔
عبودیت سے خارج ہونا ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ اگر انسان محض عبد
مطلق ہوتا۔ اور مالک ہونے کا شائبہ اس میں نہ پایا جاتا۔ تو اللہ تعالےٰ یہ
آیت نازل نہ فرماتا اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ کیونکہ
فروخت کا اختیار مالک کو ہوتا ہے نہ عبد کو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان
نے خود کو مالک مانا۔ تو خدا نے توبیخاً و تعریضاً یہ فرمایا۔

عارف اس آیت کے مطالعہ سے نادم و پشیمان ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ
افسوس غفلت و جہالت نے انسان کو کہاں تک پہنچایا کہ وہ اپنی اصلیت
کو بھول گیا اور وحدت و اتحاد کے دریا سے نکل کر غیریت کا جھنڈا کھڑا
کر دیا۔ اسی واسطے خدا نے غیریت کا لحاظ کر کے (اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ
فِیْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ)[1] فرمایا ہے۔ چونکہ غیریت عارفوں کے حق میں درست نہیں

---

[1] یعنی طالبان جنت اپنی اصلی ہستی کو بھول کر میووں وغیرہ لذائذ نفسانی کے شغل میں رہینگے۔

اس لئے بعض عارفوں کا قول ہے کہ اے اللہ ہم کو اُن اغیار سے نہ بنا۔

چوتھی علامت ان کی یہ ہے۔ کہ وہ ہر ایک نعمت و چیز کو ذریعہ نعمت و وسیلہ راحت و محبت خیال کرتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو اس خیال سے کہ ظاہر میں نعمت ہے اس کی نعمت کا شکر بجالاتا ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ شاید کسی ابتلاء کا موجب نہ ہوسکے مکر و استدراج سے ڈرتا ہے جیسا کہ خدا نے متولین کفار کے حق میں فرمایا (سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ) اس واسطے عارف کامل جب نعمت کو وسیلہ بلاء و محنت بھی جانتا ہے تو وہ نعمت کے ملنے سے مغرور نہیں ہوتا اور اس کے ہونے سے اپنے سے ادنیٰ پر تکبر نہیں کرتا۔ لیکن عوام کا نفس نعمت ظاہری یا باطنی کے حاصل ہونے سے جب دیکھتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ تو اس کے دل میں تکبر و سرکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو آیت ذیل (كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى) میں غور کرنے والے کے واسطے صراحتہً بیان کیا ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ دنیا میں تکلیف بہ نسبت آرام کے زیادہ ہے۔ کیونکہ کوئی نعمت و راحت ایسی نہیں ہے جو بلاء و تکلیف سے خالی ہو۔ اگر کوئی نعمت حاصل ہے۔ تو اس کے ساتھ شکر کا مطالبہ لگا ہوا ہے۔ اور یہ تاکید ہے کہ اس کو بیجا و بے محل صرف نہ کرو۔ حقداروں کا حق ادا کرو۔ مالداروں کو کیا کیا مصیبتیں ہیں جو پیش نہیں آتیں۔ وہ ٹھیک طور پر اس قول کے مصداق ہوتے ہیں ؎

دردِ سر کے واسطے صندل اگرچہ ہے مفید
اسکا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

اور بلایا و تکالیف تو خود مصائب نہیں ہے۔ دوسری تکلیف یہ ہے کہ مصیبتوں پر صبر کرو۔ اس کی شکایت کسی کے سامنے مت کرو۔ مار کھاتے جاؤ۔ اور اُف ذکرو۔ شکایت کا لب ہر وقت بند کرو۔ اور نہایت حوصلہ و دلیری سے انہیں برداشت کرو۔ بس معلوم ہوا کہ دنیا دار بلا و محنت کا گھر ہے۔ اور کسی صورت میں کوئی نعمت نقمت[1] سے اور کوئی فائدہ۔ نقصان سے اور کوئی راحت رنج سے خالی نہیں اور یہ مضمون اللہ تعالیٰ کے قول (اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ) سے ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہے کہ جو کشتی میں سوار ہوں اور انہیں آندھی و طوفان ہر طرف سے گھیر لیں۔ اس میں یہ اشارہ کیا ہے کہ دریا میں کشتی پر سفر کرنا ظاہر میں خدا کی نعمت ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے پار جا کر اپنے مقاصد دلی تجارت وغیرہ کر سکتے ہیں۔ اس واسطے خدا ان سے شکر کا طالب ہوا اور جب طوفان آتا ہے اور کشتی ڈگمگانے لگتی ہے۔ اور ہر ایک کو اپنے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اور وہی چیز جو باعث نجات ہے ذریعہ ہلاک معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کو اپنے حق میں مصیبت خیال کرتے ہیں تو خدا ان سے صبر و رضا کا طالب ہوتا ہے۔ پس غور کرو تدبر سے کام لو۔ کہ ایک ہی چیز ایک حالت میں ذریعہ راحت و نجات اور وہی چیز دوسری حالت میں باعث موت و ہلاک ہو جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کلام اللہ میں تدبر کرنے والے کے واسطے تمام علوم جو خدا کے تقرب کا ذریعہ ہیں موجود ہیں۔ پس جو شخص تدبر و تفکر و ادب سے کام لیتا ہے۔ اس پر علوم قرآنیہ منکشف ہو جاتے ہیں۔ نہ نہ قرآن کا سمجھنا

---

[1] نقمت، بجنے سختی۔ تکلیف۔

ممکن نہیں اور جو شخص غور و فکر سے کام نہیں لیتا - وہ خدا کے درگاہ میں داخل نہیں ہو سکتا - اور علوم ظاہریہ سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا - اور خدا کی عظمت و منزلت نہیں پہچان سکتا۔ دیگر علامت عبد کامل کی یہ ہے کہ وہ تمام اقسام کی عبادات و ہر قسم کے خضوع و خشوع اور ذلت و عبودیت کو خدا کے عظمت و جلالت کے مقابلہ میں ناقص و بے ادبی خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خواہ کیسی ہی سرگرمی سے اور کیسی خشوع و خضوع سے عبادات کی جاوے اس کی قدر و منزلت کی عظمت ادا نہیں ہو سکتی چنانچہ (مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے - اور وہ اپنی عبادت کو اگرچہ اعلیٰ درجہ کی بھی ہو - لائق عذاب و قابل عقوبت خیال کرتا ہے اور اللہ کے کرم و فضل کو ذریعۂ نجات سمجھتا ہے نہ اپنی عبادت و خدمت کو - جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس قدر سخت عبادت کے کہ آپ کے پاؤں سوجھ جاتے تھے اور ہر وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے - حق خدمت کا دم نہ مارتے تھے اور (لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ) فرماتے تھے - تو بھلا کسی ولی یا عارف کی کیا ہستی ہے - کہ وہ اپنی عبادت پر غرّہ ہو کر معرفت حق کا دم مارے - امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ بندہ سجدہ کرتا ہے اور کمال خضوع و خشوع پیدا کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ اس وقت اعلیٰ علیین کے مرتبہ تک پہنچا ہوا ہے حالانکہ اگر اس کے اسی سجدہ کے گناہ روئے زمین پر تقسیم کئے جاویں تو سب لوگ اس سے ہلاک ہو جاویں - اور عارف جو عبادت کرتے ہیں تو بہ حیثیت عظمت و جلال کرتے ہیں نہ باعتبار شرعیت

لہ احوط جس میں کوئی شک و شبہ نقصان کا نہ ہو۔

اور اپنی عبادت کو اس کی عظمت کے مقابلہ میں حقیر و ناچیز خیال کرتے ہیں۔ دیگر علامت یہ ہے کہ وہ امور شرعیہ میں سے اولیٰ و احوط کو اختیار کرتے ہیں اور ایسا کام اختیار کرتے ہیں جس بات کی کسی امام کی مخالفت نہ ہو سکے مثلاً اگر کوئی کام اس کے اپنے امام کے نزدیک سنت ہے اور دوسرے امام مذہب کے نزدیک واجب ہے تو عارف اسے واجب کی طرح سے ادا کرے گا۔ اور جو امور دوسرے امام مذہب کے نزدیک مکروہ یا حرام ہیں اور اس کے امام کے نزدیک وہ ایسے نہیں ہیں۔ تاہم وہ ان سے مکروہ و حرام خیال کر کے ان سے پرہیز کرتا ہے۔ مثلاً عارف شافعی المذہب وضو میں سارے سر کا مسح کرے گا اگرچہ اس کے امام کے نزدیک سارے سر کا مسح واجب نہیں ہے۔ اگر مالکی ہے۔ کتے کی نجاست سے طہارت حاصل کرے گا اگرچہ اس کے امام کے نزدیک کتے کی نجاست سے طہارت ضروری نہیں۔ اور کتے کے منہ لگے برتن کو سات دفعہ دھو کر پاک کرے گا۔ اور اگر حنفی ہے۔ تو فرج کو ہاتھ لگ جانے سے وضو کر لے گا۔ اگر ابو حنیفہؒ کے نزدیک مس فرج سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ کیونکہ جس کی عبادت تمام مذاہب کے موافق درست ہو وہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی مذہب کے مطابق باطل ہو۔ پس معلوم ہوا کہ عارفوں کے نزدیک مکروہ کا مرتبہ حرام کے برابر ہے۔ اور مستحب کا رتبہ واجب کے مساوی ہے۔ مگر یہ تعظیم و جلالت کے اعتبار سے ہے نہ شرع کی حیثیت سے۔ گویا ان کے نزدیک احکام شرع کے مراتب جو شرع و تمدن کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ سب عظمت و جلالت کے رو سے وجوب کے درجہ میں ہوتے ہیں۔ اور اصطلاحات علماء فرض و واجب و سنت موکدہ و

احوط جس میں کوئی شک و شبہ نقصان کا نہ ہو۔

سنت غیر موکدہ و مستحب و نوافل و مباح و مکروہ وغیرہ) سے غافل ہوتے ہیں اور ہر ایک حکم شرعی کو اس کی جلالت و عظمت کی حیثیت سے اس طرح ادا کرتے ہیں گویا ان کے واسطے ہر ایک امر واجب و فرض عین ہے۔ اور خدا کے ساتھ نہایت ادب و انکسار کا معاملہ ہوتا ہے۔ اسی واسطے ان کے مراتب دنیا و آخرت میں بلند ہوتے ہیں۔ اس سے کسی کو یہ وہم نہ پڑے کہ وہ ظاہری مذہب کے قائل ہوتے ہیں۔ نہیں وہ ظاہری مذہب کو جھگڑا و نزع سمجھتے ہیں اور وہ ایسے جنگ و جدال سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک تطوع (دل سے کام کرنا) کا درجہ فرض (کسی کے کہنے سے بلا سمجھے سوچے) کے درجہ سے بڑا ہے۔ اور تقرب و شرافت تطوع و نوافل سے ہی حاصل ہوتی ہے نہ کہ فرائض سے جیسا کہ حدیث (لَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبُّہٗ) سے معلوم ہوتا ہے۔ اور جوں جوں بندہ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے اوامر و نواہی عظمت و رفعت اس کے دل میں زیادہ ہوتی جاتی ہے اور جس قدر انسان معرفت سے دور ہوتا جاتا ہے۔ خدا کی محبت و ذوق میں کاہل و سست ہوتا جاتا ہے اور جس قدر انسان زیادہ عارف ہوتا ہے اتنا ہی اپنے مولا سے زیادہ ڈرتا ہے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے کہ (اَنَا اَعْرَفُکُمْ بِاللّٰہِ وَاَخْوَفُکُمْ) میں تم سے زیادہ عارف ہوں اور بہ نسبت تمہارے زیادہ ڈرتا ہوں۔ انسان اگر احکام الٰہی کی تعظیم کرتا ہے۔ تو اس کی محبت خدا کے ساتھ بڑھتی ہے اور تقرب حاصل ہوتا ہے۔ اگر اس کے برخلاف کرتا ہے تو اس کی پاداش میں خدا سے دور ہوتا ہے اور عذاب و مقت کا مستحق ہوتا ہے۔ جو معرفت الٰہی انبیاء کو ہوتی، اولیاء کو نہیں ہوتی۔ اور جو کچھ انبیاء سمجھتے ہیں وہ اولیاء نہیں سمجھ سکتے۔ اور جو سمجھ اولیاء کی ہے۔ عوام کی نہیں ہے۔ اور جس درجہ

معرفت پر اولیا رہتے ہیں عوام کا وہ درجہ نہیں ہے ۔ مگر ہر ایک اپنے درجہ
و مرتبہ معرفت کے موافق خدا کے احکام کی تعظیم کرتا ہے اور مقصود بالذات
بھی تعمیل احکام سے اظہار عظمت و جلالت ہے۔ پس جو شخص کسی طریق سے
محض عظمت الہٰی کے واسطے عبادت کرتا ہے ۔ اس پر کسی کا حق نہیں کہ اعتراض
کرے اور کہے کہ تیرا طریق عبودا اچھا نہیں ہے اور میرا طریق مخصوص بہتر ہے۔
کیونکہ اعتراض کرنے میں خدا کے ساتھ بے ادبی و گستاخی کرتا ہے ۔ جیسا کہ
موسیٰ اور گڈریہ کے مشہور قصہ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ علاوہ اس کے اگر دو شخص
ظاہری طریق عبادت میں موافق بھی ہو جائیں تو بھی طریق باطنی و خیال قلبی اور
اخلاص دلی میں موافقت ممکن نہیں اور خدا کا تعلق دل سے ہے نہ افعال
ظاہریہ سے تو پھر افعال ظاہریہ میں شریک و موافق ہونے سے کیا فائدہ ۔ اور
شرکت ظاہری معرفت الہٰی میں کیا مدد دے سکتی ہے ۔ اور سمجھنے کی بات تو یہ
ہے کہ انسان جیسا کرتا ہے ویسا پاتا ہے ۔ اگر تیرا خیال اور تیرا طریق تیرے
واسطے اچھا ہے ۔ تو دوسرے کا اعتقاد اور اس کا طریق اس کے واسطے حق ہے
جیسا تو کسی کے خیال کو برا خیال کرتا ہے ویسا وہ بھی تیرے خیال کو برا مانتا ہے۔

حاکم سے مرفوعاً روایت ہے کہ جو شخص اس کو امر جاننا چاہیے کہ اس کا درجہ
اللہ کے نزدیک کیا ہے ۔ اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے نزدیک اللہ کا مرتبہ
قیاس کرے ۔ یعنی جیسی اس کے دل میں اللہ کی عظمت و خفت وغیرہ ہو گی
ویسے ہی اللہ کے نزدیک بھی اس کی عظمت و خفت ہو گی ۔ اگر اس کے دل میں
اللہ کی عظمت ہے تو اللہ بھی اس کی عظمت و عزت کرتا ہے ۔ اور اگر اس کے
دل میں اللہ کی خفت و حقارت ہے تو وہ بھی حقیر و خفیف و ذلیل ہو گا ۔ حاصل
کلام یہ کہ جو عارف دنیا کے مصائب اور حزن کو دیکھ کر ان سے دست بردار ہو جاتا

ہے اور ان کو ذریعہ نجات و آرام نہیں سمجھتا - نہ وہ دوسرے دنیاداروں پر اعتراض بھی نہیں کرتا - اور ان کو دنیا کے کاموں میں مستغرق دیکھ کر ان پر اعتراض نہیں کرتا - کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ابھی اس قابل ہیں کہ دنیا کی محبت میں لگے رہیں - اور ابھی ان میں وہ روشنی پیدا نہیں ہوئی جس سے نہ روحانی و نفسانی لذائذ میں امتیاز کر سکیں - اور ان درجہ بدرجہ ہر ایک وقت ہر ایک آن خود ترقی کر رہا ہے - جب منزل معرفت میں پاؤں دھرنے کے قابل ہو جائے گا - خود ہی اس کے نظر میں مراتب سابقہ حقیر معلوم ہونے لگیں گے - اور جو شخص اس راز کو سمجھ جاتا ہے وہ دوسرے پر اعتراض کرنا چھوڑ دیتا ہے - کیونکہ وہ جانتا ہے کہ منزل مقصود ایک ہوتی ہے اور راستے مختلف و متعدد ہوتے ہیں - ایسے ہی مقصود بالذات عبادت سے معرفت الٰہی ہے - اور وہاں تک پہنچنے کے واسطے جو راستے مقرر ہیں وہ مختلف اصطلاحیں و الفاظ ہیں اور ہر ایک اپنی اصطلاح رکھتا ہے اور اصطلاح میں کسی کا مناقشہ و اعتراض نہیں ہوتا - فقیہ اپنی اصطلاح سے نحوی کی اصطلاح پر اعتراض نہیں کرتا اور فقیہ صوفی پر اعتراض نہیں کرتا - اور صوفی فقیہ پر اعتراض نہیں کرتا - اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اگر کوئی شخص خلاف نص صریح بھی ہو تو اس پر بھی اعتراض نہ کرنا چاہیئے نہیں ہمارا مطلب یہ نہیں ہمارا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے فہم و خیال سے دوسرے پر اعتراض کرنے کا مجاز نہیں - ہاں جو شخص اس بات کا دعویٰ کرے کہ اس سے تکالیف شرعیہ ساقط ہیں اور کوئی دلیل اس کے دعویٰ کے تصدیق پر قائم نہ ہو تو وہ شخص کاذب ہے اور قابل اعتراض ہے - مثلاً اگر کوئی صوفی اوامر الٰہی بجا نہ لاتا ہو اور محرمات سے پرہیز نہ کرتا ہو اور باوجود اس کے ہوا میں اڑتا پھرے تو ہمیں اس پر اعتقاد نہ کرنا چاہیئے - اور اس کو قابل اعتراض سمجھنا چاہیئے پس اگر کوئی ایسا ہو تو فقیہ

کو چاہیئے کہ اسے نصیحت اور احکام شرعیہ ظاہریہ کے پابند ہونے کی تاکیت
تاکید کرے - اور ایسے فقیر کو بھی چاہیئے کہ اس وقت میں فقیہ کی نصیحت قبول
کرے اور احکام ظاہریہ کی پابندی کرے - اور عالم ظاہری کو بھی چاہیئے کہ
صرف ظاہر پر نہ مٹا رہے بلکہ کچھ آگے بڑھنے کی کوشش کرے اور اگر کوئی ولی
صادق عارف کامل مل جاوے تو اس کی نصیحت و خیرخواہی سے منہ نہ موڑے
اور اس کی صحبت سے فیض اٹھاوے و باطن کو صاف کرے کیونکہ عارف
کامل بہ نسبت عالم ظاہری کے احکام شرع اور اس کے اسرار - وثوق اچھا
سمجھتا ہے - اور صوفی جو کچھ کہتا ہے - وہ عین الیقین سے کہتا ہے اور اس
کا علم اس کی کنہ تک پہنچا ہوا ہوتا ہے - اولیاء اللہ کو فہم احکام کے واسطے
آلات ظاہریہ (صرف و نحو و لغت و معانی و غیرہ) کی ضرورت نہیں ہوتی
یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتراض کرنا نہایت
ہی خوب چیز ہے اور خدا کی رحمت ہے - اس سے ایک دوسرے کی ترقی ہوتی
ہے اور ان کے دل اخلاق رذیلہ سے صاف ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کو
اپنے خیال کے حسن و قبح کے امتیاز کا موقع ملتا ہے - ہر ایک شخص یہی چاہتا ہے
کہ میں اپنے خیال سے دوسروں کو فائدہ پہنچاؤں - اور اپنے خیالات کو دوسرے
سے اچھا و افضل خیال کرتا ہے - پھر مباحثہ اور مناظرہ کرنے سے اپنی خوبیوں
اور برائیوں میں امتیاز کا ملکہ ہو جاتا ہے - اور عمل و حلم کی عادت راسخ ہوتی
جاتی ہے - جو شخص مباحثہ کا عادی نہ ہو اگرچہ کتنا ہی خود کو فاضل خیال کرے
اس کی مثال ایک شمع کی ہے جس کے نیچے کچھ اندھیرا ضرور رہتا ہے لیکن
جب دو ملکر کسی امر پہ غور کرتے ہیں تو ان کی مثال دو شمع کی سی ہو جاتی ہے
کہ کسی کے نیچے اندھیرا نہیں رہتا - ایک اپنی تاریکی کو دوسرے کی روشنی سے

اور دوسرا اپنی تاریکی کو پہلے کی روشنی سے دور کر لیتا ہے۔ غرض کہ مباحثہ و مناظرہ خدا کی رحمت اور جوہر انسان کا صیقل ہے۔

حقیقت میں اگر فقہار علم کی حقیقت سے واقف ہو کر اس پر بھی عمل کریں تو وہی صوفی ہیں۔ گویا صوفی اور فقیہہ میں امر فارق عمل پر ہے۔ اگر عمل کرتا ہے تو صوفی ورنہ فقیہ عالم ظاہری۔ گویا فقیہ کے واسطے علم شریعت و علم ظاہری ہونا ضروری ہے۔ اور صوفی کے لئے ضروری نہیں کہ علوم ظاہریہ سے بھی واقف ہو۔ لیکن علمار عارف وہ ہوتے ہیں جو اپنے علم و فہم کو اس علم ناپیداکنار کے مقابلہ میں حقیر و ناچیز سمجھتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ (فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ) کے مطابق علم کے بے انتہا مدارج ہیں۔ اور ایک سے دوسرے کو فضیلت انہیں مراتب کی کمی و بیشی سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہر ایک روزہ دار اور نمازی ابوبکر صدیق رضؓ کے برابر ہوتا اور ہر ایک عالم کا درجہ مساوی ہوتا پس معلوم ہوا کہ ایک کو دوسرے پر فضیلت درجات علم کے حصول کے باعث ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول (يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ) سے ثابت ہوتی ہے۔ پس انبیار غیروں سے بباعث قوت علم و درجات فہم کے ممتاز ہوتے ہیں۔ میرے شیخ رضی اللہ عنہ نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں دو لاکھ سینتالیس ہزار نو سو ننانوے علوم ذکر کئے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کو میں نے اپنی کتاب تنبیہ الاغبیار میں اولیار کے علوم کے نمونہ کے طور پر درج کیا ہے جس کو شوق ہو وہاں دیکھ لے۔

میں اپنے شیخ شیخ الاسلام ذکریا الانصاری سے اکثر سنا کرتا تھا۔ کہ

لہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک محض مومن مقلد اور عالم محقق میں مدارج کے لحاظ سے فرق ہے۔

اعتقاد اگر نفع نہ دے گا تو نقصان بھی نہیں دینے کا۔ اور فقیہ کو اگر صوفیوں کے اصطلاحات اور ان کے اسرار و نکات سے واقفیت نہیں تو وہ خالی ہے خیال رکھنا چاہیئے کہ صوفیوں کا طریقہ کتاب و سنت کے موافق ہے۔ جو ان کے مخالف ہو وہ راہ راست سے دور ہے۔ سید الطائفہ ابوالقاسم جنیدؒ نے کہا ہے کہ اصلی و سابق صوفیوں کو زمانہ حال کے برائے نام صوفیوں پر قیاس نہ کرو اس وقت کے صوفی صرف ان سے نسبت کا تعلق رکھتے ہیں اور الفاظ متصوفہ کو یاد رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت حال و اصلیت مآل سے محض عاری ہیں زمانہ سابق کے صوفی متبع بالسنۃ اسرار شریف سے واقف فرائض ظاہریہ کے پابند پرہیزگار نیکوکار خداترس معرفت شناس تھے۔ جیسا کہ انکی کتابوں اور ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے۔ اور جو غافل صوفیوں کے حالات سے منکر ہیں وہ ایسے صوفی ہیں جو چھوٹے درجہ میں ان کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں یعنی برائے نام صوفی ہوتے ہیں جو زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے قریب تھا۔ اس زمانہ کے صوفی واقعی باصفا ہوتے ہیں ان کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا لوگ رجعت قہقرائے ترقی معکوس کرتے گئے چنانچہ حدیث (خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ) اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ابوبکر شبلی نے لکھا ہے کہ مجھے میرے استاد نے کہا کہ اے لڑکے اگر تیرے دل میں ایک ہفتہ تک سوائے اللہ کے کسی غیر کا خیال آوے۔ تو ہمارے پاس مت آئیو۔ کیونکہ اس حالت میں تو شاگرد بننے کے لائق نہیں ہوگا۔ پس غور کا مقام ہے [illegible] شاگردوں کی یہ کیفیت ہے تو مشائخ کا کیا حال ہوگا [illegible] مشائخ کو دیکھو اور اس وقت کے شاگردوں کو [illegible] شاگرد بڑھ گئے تھے

یا اس وقت کے مشائخ ۔ اور اُس وقت کے مشائخ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے حسنؒ نے کہا ہے کہ میں نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ سے بڑھ کر کسی کو عابد نہیں دیکھا اپنی عمر کے اٹھانویں سال تک چارپائی پر نہیں سوئے۔ مگر موت کے وقت وہ اپنے جوان شاگردوں سے فرمایا کرتے۔ کہ میری طرح بوڑھے ہونے سے پہلے کچھ کام کر لو۔ ورنہ وہ اس حالت پیری میں بھی اس قدر ریاضت وعبادت کرتے کہ ہم باوجود جوان ہونے کے ان جیسی ریاضت ومحنت نہیں کر سکتے تھے۔ حاصل کلام کہ جو شخص ولی عارف کامل کے ہاتھ پر تربیت پاتا ہے۔ وہ عبودیت اور اس کے آداب سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس رسالہ کے خاتمہ میں کچھ آداب عبودیت مذکور ہوں گے۔

دوسرا باب علم نافع کے تلاش کے بیان میں

جاننا چاہیئے کہ علم نافع وہ ہے جس میں اخلاص وارادت ہو۔ اور جو شخص اخلاص رکھتا ہو اس کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کے خیالات اور اقوال سے جو اس کے حق میں کہیں رنجیدہ نہ ہو۔ مثلاً اگر کوئی اس کے حق میں کہے کہ فلاں جاہل ہے۔ کچھ نہیں سمجھتا۔ اور علم کو شہرت کی خاطر حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے علم پر عمل نہیں کرتا ہے۔ تو ان باتوں سے مکدر نہ ہو اور اس کے دل پر کوئی رنجیدگی کا اثر نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اس کے حق میں کلمات تعریف کرے۔ تو اس کی تعریف سے خوش نہ ہو اور اس کے دل پر کوئی خوشی کا اثر ظاہر نہ ہو بلکہ ہر دو حالت میں مطمئن و برقرار رہے۔ اور شانت روپ ہو جاوے اور لوگوں کے کثرت ہجوم سے اس کے دل میں کوئی بڑائی کا خیال پیدا نہ ہو۔ اور اپنے دل کو اخلاق رذیلہ و خصائل رذیلہ مثل تکبر و حرص و طمع و دعویٰ علم اور دنیا کی محبت سے پاک رکھے اور بخیل لوگوں کے ہاتھ سے کسی چیز کا طمع نہ کرے۔ پس نیک شخص وہ ہے جو علم ضروری و واجب کے جاننے کے بعد ایسا کام اختیار کرے جس کا ثمرہ دنیا میں بھی ظاہر ہو جاوے۔ ابراہیمؒ ادہم ایک پتھر کے پاس سے گزرے اس پر لکھا تھا کہ مجھے اٹھالو اور عبرت حاصل کرو ابراہیمؒ نے اس کو اٹھایا۔ اس کے نیچے لکھا تھا کہ "تو جو کچھ جانتا ہے اس پر عمل

نہیں کرتا۔ پھر تو دوسرے علم کی تلاش میں کیوں ہے" یہ بات بھی یاد رکھنی
چاہیئے کہ جب تک کوئی طالب علم عادی گروہ صوفیہ و فقراء کا معتقد نہ ہو
اور ان کی صحبت فیض اثر سے استفادہ نہ کرے وہ اپنے علم پر پوری طرح
عمل نہیں کر سکتا اور اس کے آداب و قواعد سے متمتع نہیں ہو سکتا۔ اور انسانیت
و شریت کے مفہوم سے بخوبی مطلع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بغیر رہبر کامل کے نفس
کے وساوس و دل کے شکوک رفع نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ محض علم بغیر تربیت
کے نفس امارہ کو تقویت دیتا ہے۔ اور جوں جوں ایسا علم بڑھتا جاتا ہے
اس کا نفس قوی ہوتا جاتا ہے اور تکبر کرتا ہے۔ اور راہ راست و خیریت
سے منحرف ہو جاتا ہے۔ شیخ عزیز الدین بن عبدالسلام نے فقراء صوفیہ کے
مذہب کی صداقت پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اکثر کرامات
و استجابت دعوات ہوتی رہتی ہیں۔ اور محض عالم شریعت فقیہ کے ہاتھ سے
کسی نے کبھی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ ہاں جو فقیہ ہو کر صوفیوں کے طریق پر
چلے اس سے کرامات صادر ہوتی ہیں۔ جو شخص ان کی کرامات کو نہیں مانتا ان
کی برکتوں سے محروم رہتا ہے اور ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو شخص ان کے طریق میں
داخل ہونے کے بغیر ان پر اعتراض کرتا ہے اور ان کی شرافت و کرامت
سے انکار کرتا ہے اس کا چہرہ ممقوت و مبغوض ہو جاتا ہے۔ اور اس کے چہرے
پر افسردگی و پژمردگی و نحوست و خباثت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ اور
ایسا شخص گو عالم ظاہری ہے۔ تو اس کے علم سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا اور
لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت و توقیر نہیں ہوتی۔

شیخ یحییٰ نووی باوجود کمال علم و جلالت و صلاحیت و بزرگی کے شیخ
مراکشی کی خدمت میں دمشق کے باہر جاتے۔ اور جو مسائل شرعیہ [illegible]

ہوتے شیخ سے حل کرواتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر صوفیار کرام بہ نسبت
علمار ظاہریہ کے اسرار شرعیہ سے زیادہ واقف نہ ہوتے تو نووی جیسا فاضل
اجل کیوں ان کی خدمت میں جاتا اور نیز ان کے مذہب کی صداقت کی دلیل
یہ ہے کہ جب کوئی شیخ مرجاتا ہے تو اس کا خلیفہ اس کی جگہ لیتا ہے ۔ اور برابر
سلسلہ ہدایت وانکشاف کا جاری رہتا ہے ۔ اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے والے
ہر ایک زمانہ میں ہوتے رہتے ہیں ۔ اور اسرار و نکات شریعت ہمیشہ ہمیشہ سینہ
بہ سینہ مستعدوں پر کھلتے چلے آتے ہیں ۔ پس معلوم ہوا کہ فقرار و صوفیار کرام قواعد شریعت
پر قائم ہوتے ہیں ۔ اور کامل عالموں اور کامل صوفیوں میں کوئی نزاع و اختلاف
نہیں ہوتا ۔ جنگ و جدال و نزاع و فساد صرف ناقص صوفیوں اور ناقص عالموں
میں ہوتا ہے ۔ مثلاً ناقص فقیہ جب ناقص فقیر کو یہ کہتے سنتا ہے کہ بندہ کا
کوئی فعل نہیں ہر ایک فعل کا فاعل خدا ہی ہے ۔ تو وہ کہہ اٹھتا ہے ۔ کہ تو
تو بدعتی و جبری ہے ۔ یا جب اس سے یہ سنتا ہے ۔ کہ " بندہ کسی چیز کا مالک
نہیں اور کسی چیز پر اس کا کوئی حق نہیں " تو وہ اس سے انکار کرتا ہے ۔ اور
آپس میں لٹھم لٹھا کی نوبت پہنچتی ہے ۔ لیکن اگر انصاف و غور سے دیکھا جاوے
تو ہر دو اپنے اپنے دعویٰ میں سچے ہیں ۔ کیونکہ ہر دو ناداں ہیں اور حقیقت
امر سے کوئی آگاہ نہیں ۔ اور ناداں ہمیشہ معذور ہوا کرتا ہے ۔ ایاقعیؒ نے
کہا ہے کہ میں دس سال اس تردد اور کشمکش میں رہا کہ کون سا طریقہ اختیار کروں ۔
فقرار یا علمار کا ۔ اسی اثنار میں یمن میں ایک عارف کامل سے ملاقات ہوگئی ۔
انہوں نے اپنے مکاشفہ سے میرے دل کی حالت معلوم کرلی اور فرمایا کہ اے
بچے ! فقیری ابتدار فقیہ کی انتہا ہے ۔ کیونکہ ہر ایک چیز کو چھوڑ دینا اور عبادت
میں اخلاص اور اس کا معاوضہ طلب نہ کرنا ۔ فقیہ کا ابتدائی درجہ ہے ۔ اور فقیہ

کا انتہائی۔ اور فقیر کو اس درجہ کے بعد کئی مراتب قرب و معرفت طے کرنے پڑتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ لو ہم تمہیں علم ظاہری کا نتیجہ اور علم فقر کا ثمرہ دکھاتے ہیں۔ یہ کہہ کر ایک شخص کو کہا کہ جا کر فلانے بڑے عالم کو بلا لاؤ۔ اور اپنی جماعت کو فرمایا کہ جب مولوی صاحب تشریف لاویں تو ان کی تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہونا اور بیٹھنے کو جگہ نہ دینا۔ جب مولوی صاحب تشریف آور ہوئے۔ تو سوائے جوتیوں کی جگہ کے کوئی جگہ بیٹھنے کو نہ پائی۔ اور کسی نے ان کی تعظیم و تکریم نہ کی اور کوئی ان کی طرف ملتفت نہ ہوا۔ پس مولوی صاحب رنجیدہ ہوئے اور کلمات کفر زبان پر لائے۔ شیخ نے کہا کہ اے فقیہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تیرے دل میں کچھ (تکبر و شہرت وغیرہ گناہ) ہے فقیہ نے کہا کہ میں تیرے دل میں اپنے سے زیادہ پاتا ہوں۔ اور غصہ سے شیخ کو گالیاں دیتے چلا گیا۔ فرمایا کہ محض علم فقہ کا یہ ثمرہ ہے۔ پھر ایک فقیر کو طلب کیا۔ اس کے واسطے بھی جماعت کو وہی حکم دیا جب وہ آیا اور کوئی اس کی تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہوا۔ اور کسی نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو وہ ہنسا اور جوتیوں کی صف میں بیٹھ گیا۔ شیخ نے اسے کہا کہ میں اپنے دل میں تیری طرف سے کچھ پاتا ہوں۔ اس نے کہا کہ حضور اگر ایسا ہے تو میں توبہ کرتا ہوں۔ اور اپنا سر ننگا کر دیا اور پناہ مانگی۔ اس کے بعد شیخ نے مجھ سے کہا کہ دیکھ کہ فقر کے راستہ کا یہ ثمرہ ہے۔ پس میں نے فقر کا راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ اس حال تک پہنچ گیا جس کو تم دیکھ رہے ہو۔ پس عقلمند اس حکایت سے نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ کثرت علم پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔ کثرت علم اس وقت مفید ہے جب عمل بھی ساتھ ہو۔ اور کوئی یہ خیال نہ کرے کہ علم کی فضیلت تو احادیث سے ثابت ہے جیسے کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَالْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں علماء

سے وہی علماء مراد ہیں جو باعمل ہوں۔ اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے
کہ جس نے علم زیادہ پڑھا اور عمل نہ کیا وہ اللہ تعالیٰ سے دور جا پڑتا ہے۔ اس کے
انبیاء کے حقیقی وارث وہ محدث ہیں جنہوں نے احادیث کے سلسلہ کو سند متصل
کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے شیخ کل بھی یہی
فرمایا کرتے۔ کہ محدثین ہی حقیقت میں رسالت کے مبلغ (پہنچانیوالا) اور روحی
کی برداشت کرنے والے ہیں اور وہی تبلیغ میں انبیاء کے وارث ہیں۔ اور فقہا کا
بلا معرفت وجہ و دلیل یہ درجہ نہیں ہے۔ اس واسطے قیامت کے دن ان کا حشر
رسولوں کے ساتھ نہیں ہوگا بلکہ وہ عوام الناس کے زمرہ میں ہوں گے۔ اور ان پر حقیقتاً
علماء کا لفظ اطلاق نہیں ہو سکتا۔ علماء حقیقی اہل حدیث ہی ہیں ایسے ہی زاہد و
عابد طالبان آخرت بھی حدیث کی حکمت نہیں سمجھتے فقہاء کی طرح عوام الناس
کے ساتھ اٹھائے جاویں گے اور زاہدوں و عوام الناس میں صرف اعمال صالحہ
سے تمیز ہوگی نہ قرب و معرفت سے۔ اور فقہاء و عوام میں علم سے امتیاز ہوگا نہ
کسی درجہ تقرب و توصل سے جب یہ معلوم ہو چکا کہ بغیر عمل کے فائدہ نہیں دیتا اور
عمل صفائی باطن کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ تو ایسے رہبر کامل کی تلاش کرنی چاہیئے
جو سیدھے راستہ پر چلائے اور دل کی کدورت کو ایک دم میں صاف کر دے۔
کیونکہ ہر ایک کام کے واسطے ایک راستہ ہوتا ہے اس طریقہ کو وہی جانتا
ہے جو اس پر چلا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کی آیت ذیل (وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ
أَبْوَابِهَا) سے معلوم ہوتا ہے۔ شیخ عبادہ مالکی۔ میرے آقا شیخ مدین سے
ملاقی ہوئے۔ شیخ مدین نے ان کی تکریم و تعظیم نہ کی اور ان کی طرف متوجہ
نہ ہوئے۔ شیخ عبادہ نے کہا کہ آپ نے میری تعظیم کا حق کیوں ادا نہیں کیا
شیخ مدین نے کہا کہ تو مشرک ہے۔ اس نے پوچھا کس طرح۔ کہا اس خیال

۱؎ گھروں میں ان کے دروازے سے آنا چاہیئے یعنی ہر ایک چیز کا کب مرشد ہے مگر اسی طریقہ سے تلاش کرنا چاہیئے۔

سے تو تعظیم و اکرام کا طالب ہے جو خاصہ خدا کا ہے ۔ پس جو شخص خدا کی صفات خاصہ میں شریک ہونا چاہے اور اس کا مثل بنا چاہے ۔ وہ تعظیم کے لائق کیونکر ہو سکتا ہے ۔ بلکہ وہ تو اہانت و حقارت کے لائق ہے ۔ شیخ عبادہ یہ سن کر ایک ساعت خاموش رہا پھر کلمہ پڑھا اور کہا کہ میں توبہ کرتا ہوں اور حقیقت اسلام اب سمجھتا ہوں کیونکہ اسلام یہی ہے کہ خدا کی فرمانبرداری کرنا اور کسی صفت میں اس کا مقابلہ نہ کرنا اور اعمال صالحہ بجا لانا اور اپنے نفس کو سب سے حقیر سمجھنا ۔ اس حکایت سے نتیجہ نکلتا ہے ۔ کہ صراط مستقیم بہت مشکل ہے ۔ اور اس کے کئی مدارج ہیں جس درجہ کا کوئی تابع شریعت ہوتا ہے اسی درجہ میں وہ صراط مستقیم پر ہوتا ہے ۔ اور جس قدر کوئی استقامت شریعت سے ٹیڑھا ہوتا ہے ۔ اسی قدر وہ صراط مستقیم سے منحرف ہوتا ہے ۔

دوسری علامت مخلص کامل کی یہ ہے کہ اپنے علم کو اس غرض سے ظاہر نہ کرے کہ لوگ اس کی تصدیق کریں ۔ بلکہ اس خیال سے کہ اللہ اس کی تصدیق کرے اگرچہ اس کام میں علت و وجہ تو پائی جاتی ہے ۔ اور اعلیٰ کام اگرچہ بلا غرض و غایت ہوتا ہے ۔ مگر اخلاص و خالص لوجہ اللہ کی نیت و علت بہ نسبت لوگوں کی علت سے اچھی ہے ۔ اور ایسی غرض و غایت جو انسان کو اللہ کے نزدیک کر دے اس علت و نیت سے اچھی ہے ۔ جو اللہ سے دور کر دے ۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ سوائے علم یقینی اور قطعی کے کسی دوسری حالت میں کسی سے مجادلہ نہ کرے ۔ کیونکہ صوفیائے کرام کے نزدیک وہی امر مجادلہ و مقابلہ کے لائق ہے ۔ جو ان کے نزدیک یقینی ہو ۔ اور یہ درجہ سوائے انبیاءؑ اور اہل کشف کے دوسرے کو حاصل نہیں ۔ باقی لوگ جو اس درجہ کے نہیں ہیں ۔ ان کا علم ظنی یا وہمی ہوتا ہے ۔ کیونکہ وہ اجتہاد و دلیل سے تعلق رکھتا ہے ۔ اور جن

لوگوں کو درجہ انکشاف کا حاصل ہے ان کے نزدیک امور شرعیہ کے اسرار یقینی ہیں اور ان کا حقیقی علم ان پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور ان کو مجادلہ و منازعہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو اہل مکاشفہ نہیں ہوتے ان کے دل اسرار شریعہ سے محجوب ہوتے ہیں اور سلطان اسم قاہر (خدا کا ایک اسم ہے) کے محکوم ہوتے ہیں۔ ان کے دل کی حالت اور ان کا مادہ علمی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ اہل اللہ کے کلام کو سمجھ سکیں اور ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اہل اللہ دوسرے کے کلام سے اس کی قابلیت کا درجہ پہچان لیتے ہیں۔ کیونکہ ظاہر باطن کا نمونہ ہوتا ہے۔ اور اہل اللہ اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ ہر ایک شخص اپنی ہمت و لیاقت کے اندازہ سے کلام کرتا ہے۔ اور اس کے کلام سے وہی بات ظاہر ہوتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہے۔ اور کوئی شخص اپنی لیاقت و قابلیت سے بڑھ کر قدم نہیں مار سکتا۔ اس واسطے وہ لوگوں کو ان کے حال میں معذور سمجھتے ہیں اور ان کی عقل کے موافق کلام کرتے ہیں اور ہر ایک کے کلام سے جو حق ہوتا ہے لے لیتے ہیں اور باطل کو چھوڑ دیتے ہیں۔ **دیگر** علامت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حصول علم میں ہی نہیں لگا رہتا۔ بلکہ اس نے اوقات کو تقسیم کیا ہوا ہوتا ہے۔ کچھ حصہ مطالعہ کتب و علم میں صرف کرتا ہے۔ کچھ حصہ عبادت و ریاضت میں لگاتا ہے۔ اور کسی بھلے یا برے کو دکھ نہیں دیتا۔ اور علم و عمل و اخلاص کے مراتب کو سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ علم حاصل کرے اور عمل نہ کرے یا عمل کرے اور اس میں اخلاص و ارادت نہ ہو۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ عالم میں علم کے سوا کچھ عمل بھی ہونا چاہیئے کیونکہ علم کا تعلق لوگوں کے ساتھ ہے اور عمل کا تعلق خدا کے ساتھ اور جس کا تعلق لوگوں کے ساتھ ہو اس کا فائدہ خدا کے نزدیک نہیں ہو سکتا۔ اور امام شافعیؒ کا رات کو تین حصوں

میں تقسیم کرنا اور ایک حصہ میں نماز تہجد ادا کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے قول کے پابند بھی تھے۔ اگرچہ ان کا یہ بھی مقولہ تھا کہ علم میں مصروف رہنا نوافل سے اچھا ہے۔ اہل اللہ رات و دن کے اوقات کو مناسب اعمال میں تقسیم کرتے ہیں۔ چنانچہ صبح کا وقت تہجد و استغفار میں۔ اور جمعہ کا روز نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھنے اور تلاوت قرآن میں صرف کرتے ہیں۔ اسی طرح بقیہ اوقات کو حاجات ضروریہ میں وقت کے مناسب لگاتے ہیں۔ اور اپنے ادائے افعال و اعمال میں خط و حلاوت پاتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ اندھی اونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ گاہے صواب و راستی تک پہنچ جاتے ہیں گاہے غلطی و خطا میں پڑ جاتے ہیں اور اکثر بیہودہ وغیر ضروریہ حاجات و خواہشات میں وقت کھوتے ہیں۔ مثلاً صبح ہوتے ہی صرف و نحو و لغت کے جھگڑے شروع کر دیتے ہیں۔ اور تفکر و تدبر کو کام میں نہیں لاتے۔ امام ابو حنیفہ رح کو کسی نے ان کی موت کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ جواب دیا کہ میرا علم وہاں کام نہ آیا صرف ان اوراد و اذکار سے جو میں صبح و شام کیا کرتا تھا میری مخلصی ہوئی۔ ایسی ہی جنید وغیرہ آئمہ طریق کی نسبت حکایت ہے۔

دیگر علامت اہل اخلاص کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا ادب کرتا ہے اور جس آیت کی حقیقت سمجھتا ہے وہی بیان کرتا ہے۔ عالم کل ہونیکا دعویٰ نہیں کرتا اور جو باتیں اس کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں ان کو بلا چون و چرا مان لیتا ہے اور آیات متشابہات جو اس کی عقل میں نہیں آئیں۔ ان پر بلا تاویل کے ایمان رکھتا ہے۔ اور ان میں بغیر تحقیق کے دخل نہیں دیتا اور عمل کے واسطے آیات محکمات کو ہی کافی سمجھتا ہے اور جب کبھی متشابہات

کی مراد کھل جاتی ہے تو اپنے اطمیناں کے واسطے کافی سمجھتا ہے۔ اور کسی کے
ساتھ نزاع نہیں کرتا اور نہ کسی کو اس کے منوانے پر مجبور کرتا ہے اور نہ اس میں
خوض وتاویل نہ کرنے کو ادب خیال کرتا ہے اور اس کی حقیقت وتاویل کو ان
کے حوالے کرتا ہے جو انہیں سمجھ سکتے ہوں۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ فرمایا کرتے
کہ جو شخص علم کامل نہ رکھتا ہو اور پھر وہ باطل کے پھندے میں پھنسنا نہ چاہتا ہو
تو اسے چاہیئے کہ کتاب وسنت کے ظاہری معنی پر اکتفا کرے اور ظاہر سے
آگے نہ بڑھے کیونکہ ایسے شخص کا کام تاویل (معنے باطنی واصل حقیقت) نہیں
ہے۔ وہ ظاہر کے موافق چلے اور متشابہات کے پیچھے نہ پڑے۔ اللہ اس سے
متشابہات کے نہ جاننے سے مواخذہ نہیں کرے گا اور جو شخص بصیرت باطنی و عقل
تام رکھتا ہے وہ موعظہ حسنہ اور حکمت صحیحہ سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلا سکتا
ہے۔ اور انہیں حقیقت کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ اور عقل تام سے کلام کر سکتا
ہے۔ اور باطل سے بری ہو سکتا ہے اور ایسا شخص علم صحیح کا مالک ہوتا ہے
اور تاویل و اصلیت کے بیان کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ
مسائل دینیہ کی عدم واقفیت کا اقرار کر لینا جھوٹی تاویل سے اچھا ہے۔
ابو بکر صدیق رضی سے ایک آیت کا مطلب پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا میں نہیں
جانتا۔ سائل اس کے سننے سے حیران و متعجب ہوا۔ آپ نے اس کی حالت
دیکھ کر فرمایا۔ مجھے کون سی زمین جگہ دیگی اور کون سا آسمان سایہ کرے گا۔
اگر میں کتاب اللہ میں بے سوچے کہدوں یعنی اگر میں پوری تحقیق کے بغیر کچھ
کہدوں تو میرا کہاں ٹھکانا ہوگا۔ قرآن کی حقیقت وتاویل بیان کرنا اس شخص
کا حق ہے جو اس حدیث قدسی (بی یسمع وبی ینطق وبی ینظر)[1] کا مصداق

---

[1] مجھ سے ہی سنتا ہے اور مجھ سے ہی بولتا ہے اور مجھ سے ہی دیکھتا ہے۔

ہے یعنی اس درجہ عرفان تک پہنچ گیا ہے۔ کہ بغیر آلات جسمانی کے اس کا روح کام کر سکتا ہے۔ اور جو اس درجہ پر نہیں پہنچے ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ متشابہات کے پیچھے نہ پڑیں۔ اور جس بات کو نہ سمجھ سکیں اس کو اس کے سمجھنے والے کے حوالہ کریں۔ اور اپنے اس درجہ کے فہم سے اس کی تاویل کی تلاش نہ کریں ورنہ وہ حظ و لذت عبادت اس سے جاتی رہے گی اور جرات و گستاخی میں پڑ جاوے گا۔ اور مصائب و عذاب کا نشانہ بن جائے گا۔ یہی سلف صالحین کا اعتقاد و ایمان تھا۔ کیونکہ وہ متشابہات کے علم کو خدا کے حوالہ کرتے تھے اور ان پر ایمان رکھتے تھے۔ اور حتی الوسع ان عبارات کے سمجھنے میں لگے بھی رہتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ جو لوگ ابھی درجہ انکشاف و یقین سے قاصر و ناقص ہیں اور آیات متشابہات ان کی اس وقت کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ان کو ان سے انکار نہیں کرنا چاہیئے اور ان پر ایمان و اعتقاد رکھتے ہوئے درجہ یقین تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن شریف کی حقیقی سمجھ اسی کو آسکتی ہے جو خواہشات نفسانیہ (غصہ و غرور۔ رنج و بے صبری وغیرہ) سے کنارکش ہو کر اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس واسطے اکثر آدمی بباعث حظوظ نفسانیہ و خواہشات بدنیہ میں مستغرق ہونے کے فہم قرآن سے قاصر ہیں۔ اس واسطے ایسے لوگوں کی سرزنش و توبیخ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ) یعنی جن کے دل کدورت سے صاف نہیں اور جنہوں نے کچھ بھی روحانی ترقی نہیں کی وہ محض اپنی خرابی و تنزل کے واسطے اس کی تاویل کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ اس کی اصل حقیقت سوائے اللہ و کامل صحیح علم رکھنے والے عالموں کے کوئی

نہیں جان سکتا۔ پس جو شخص چاہے کہ کلام اللہ کے معارف و دقائق اور اصل حقیقت سے واقفیت کرے اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے نفس کو رذائل و خبائث سے پاک کرے اور تقوے و پرہیزگاری و اعمال صالحہ اختیار کرے تاکہ اس کے واسطے معرفت کا دروازہ کھل جائے اور خدا خود اس کا معلم بن جائے جیسا کہ ارشاد ہے (وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ) تم اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھا وے گا۔ جب کوئی اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اللہ سے راہ راست تعلیم حاصل کر سکے۔ تو وہ سمجھتا ہے کہ ہر ایک راستہ اسی کی طرف جا رہا ہے۔ اور ہر ایک چیز اسے بے دانہ و بغیر گٹھلی نظر آتی ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آیات متشابہات (جن کی حقیقت ہر ایک شخص پر ظاہر نہیں ہوتی) کی حقیقت کھل جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آیات پھر متشابہ نہیں رہتیں نہیں بلکہ متشابہ متشابہ ہی ہے۔ اور محکم محکم۔ کیونکہ آیات متشابہ کئی پہلو رکھتی ہیں۔ اگر ایک اعتبار سے کسی کے نزدیک محکم ہو گئیں تو باقی اعتبارات سے ویسی ہی متشابہ رہتی ہے۔ اگرچہ ان کے الفاظ کی حقیقت کسی عالم کامل پر کسی جہت سے منکشف ہو جاتی ہے۔ تو دوسروں کے لئے تمام حیثیات سے متشابہ رہتی ہے۔ آیات متشابہات قرآن و حدیث میں متعدد و کثیر ہیں۔ مثلاً (۱) حروف مقطعات۔ (۲) خدا کا پہلے آسمان پر آنا اور اس کا فرشتوں کے صفوف کے ساتھ آنا اور بادلوں کے سایہ میں اترنا (۳) عرش پر قائم ہونا۔ (۴) لفظ قدم و وجہ و ید و ساق وغیرہ کا آنا (۵) خدا کا بندہ کی طرف دوڑ کر آنا۔ اگر بندہ خدا کی طرف ایک ہاتھ بڑھے تو خدا کا اس کی طرف دو ہاتھ بڑھنا (۶) صرف قلب مومن کا ہی وہی خدا کو سما سکتا ہے (۷) اس کے دونوں ہاتھوں کو کھلا ہونا (۸) ...

دونوں ہاتھوں سے اس کو پیدا کرنا (۹) نوح علیہ السلام کی کشتی کا خدا کی آنکھوں کے سامنے جاری ہونا (۱۰) انسان کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہونا (۱۱) آسمانوں کا اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے جانا (۱۲) خدا کی معیت (۱۳) الفاظ ضحک (ہنسی) فرح و تعجب - و بصر - و علم - و کلام - و حد - و مقدار - و رضا - و غضب وغیرہ کا وارد ہونا وغیرہ وغیرہ ایسے مقامات ہیں کہ ان الفاظ کے وہ حقیقی معنے جن کے واسطے وہ حالت افراد میں وضع ہوتے ہیں نہیں لئے جاتے بلکہ ان الفاظ کے معنے قرینے کے ترتیب سے جو بلحاظ محاورہ زبان پیدا ہوتے ہیں لئے جاتے ہیں - جو اشخاص محاورہ زبان کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور الفاظ کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اس غرض وغایت کو جو اظہار الفاظ سے ہوتی ہے نہیں جانتے اور مراتب ومدارج کلام نہیں جانتے اور متکلم کے منشا کو نہیں سمجھتے وہ اس قابل نہیں کہ آیات متشابہات کی اصلیت کو سمجھ جائیں - عارف کامل سمجھتا ہے کہ ان الفاظ سے جو آیات متشابہات میں وارد ہیں ان کے افرادی حقیقی معنے مراد نہیں - بلکہ ان الفاظ سے محض ذات خداوندی (جیسی وہ ہو) مراد ہے - ذات خداوندی چونکہ الفاظ میں نہیں آسکتی - انسان کو سمجھانے کا ذریعہ الفاظ ہی ہیں - اس واسطے قرآن شریف میں محض تفہیم وتعلیم کے لئے ذات مطلق کو الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے - کیونکہ متکلم کو سامع کی لیاقت کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے - پس جو سامع عقلمند ہوتا ہے وہ عقل سے ان الفاظ کی تاویل (اصل حقیقت) تک پہنچ جاتا ہے - اور جس کا دل ایمان کے نور سے روشن ہوتا ہے - وہ اس کے علم کو اللہ کے حوالہ کر کے ایمان لے آتا ہے - اور فائدہ اٹھانے میں عقلمند کے مساوی ہو جاتا ہے - اور جس کسی کی باطن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اسے ان کی حقیقت کشف سے معلوم

ہو جاتی ہے اور ذات باری کو الفاظ کے ذریعہ ادا کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے
کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک رسول کو اس کی قوم کی زبان میں خطاب کرتا ہے۔ اور اسی
زبان کے وسیلہ سے متکلم اپنے منشار کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اہل زبان الفاظ
مفردہ اور منتظمہ (جو عبارت میں ایک دوسرے سے ترکیب کھائے ہوئے
ہوں) کی مصداقات سے واقف ہوتے ہیں۔ اور ان کے ظاہری معنے اور
نطقی معنی ہونے سے ان کے اصل غرض اور حقیقت میں فرق نہیں آتا۔ علاوہ
اس کے اگر ان الفاظ کے وضعی مطابقی معنے لئے جائیں تو لازم آتا ہے۔ کہ
اللہ تعالےٰ کی ذات مادی ہو۔ کیونکہ ان الفاظ کے وضعی معنے صفات
مادیہ پر دلالت کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا تعالےٰ نے دوسرے مقامات پر
اپنی ذات کو ایسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ صفات
مادیہ سے پاک ہے چنانچہ فرمایا (لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ) (وہ مخلوقات میں
کسی کے مشابہ نہیں ہے) جس سے یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قسم کے
آیات میں تطابق و توافق تب ہی ہو سکتا ہے جب کہ آیات متشابہات کے
الفاظ کو ان کے وضعی معنے پر حمل نہ کریں مثلاً حدیث میں آتا ہے (اِذَا
تَصَدَّقَ الْعَبْدُ یُطْفِی بِصَدَقَتِہٖ غَضَبَ اللّٰہِ عَلَیْہِ) یعنی جب بندہ صدقہ
کرتا ہے تو وہ اپنے صدقہ سے اللہ کے غضب کو فرو کرتا ہے کیا کوئی عقلمند
کہہ سکتا ہے کہ یہاں لفظ غضب سے وہی غضب مراد ہے جو انسان کے
دل کی حرکت متعاقبہ کا نام ہے۔ بلکہ یہاں مراد رضامندی کی حالت ہے
جس کو اہل زبان اپنے محاورہ میں ان الفاظ سے ادا کر سکتا ہے۔ اور یہ
سب باتیں عقل و واقع کے مطابق ہیں۔ اور محاورہ زبان ان کی تائید
کرتا ہے۔ اہل عقل کو اطمینان تو اسی طریق سے ہوتا ہے۔ لیکن ایمان سے

مان لینا اور اس میں کسی قسم کا چون وچرا نہ کرنا واجب ہے کیونکہ حاکم کا حکم ہے۔ اور
اس نے خود ہی ان الفاظ کو اپنے واسطے تجویز کیا ہے۔ تو ہمارا کیا ہرج ہے کہ ہم
بھی وہی الفاظ اس کے لئے رہنے دیں اور اپنی عقل کو اس میں دخل نہ دیں۔ اور
جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم اپنے محدود علم وعقل سے اس لامحدود کا احاطہ نہیں
کرسکتے تو اپنے دل سے اس کا حکم مان لینا بہ نسبت عقل کے حکم سے ماننے کے بہتر
ہے۔ اور جو شخص عقل کے حکم کو اللہ تعالےٰ کے حکم پر مقدم مانتا ہے۔ وہ ابھی تحت
اندھیرے میں ہے۔ اس مقام کو غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے کہ یہ بحث کسی اور
کتاب میں کم پاؤ گے۔ ہم نے چند خواص جو اولیاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی کتاب
تنبیہ الاغبیاء میں (جو اولیاء کے علوم کے دریا کے مقابلہ میں ایک قطرہ ہے)
درج کئے ہیں جس کو اشتیاق ہو وہاں دیکھ لے۔ دیگر علامت یہ ہے کہ
انبیاء کے معاصی میں کلام نہ کرے خصوصاً آدم علیہ السلام ابوالبشر کی معصیت
کے باب میں۔ کیونکہ ان مقامات کا سمجھنا کامل اولیاؤں کا کام ہے۔ کیونکہ
وہ انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ اور وارث کو حق ہے کہ مورث کے علمی
مقامات کا تذکرہ کرے اگرچہ وہ خود اس درجہ پر نہ پہنچا ہو۔ مگر دوسروں
کو مناسب نہیں۔ کہ انبیاء کی نسبت لفظ معصیت وذنب کا استعمال کریں کیونکہ
ان کی معصیت اگر ہوتی ہے تو اللہ تعالےٰ کے امر کے مقابلہ میں ہوتی ہے نہ کہ
کسی انسان کے افعال کے مقابلہ سے دوسرے انسان کے افعال کی نسبت
سے تو ان کی معصیت بھی ان کے لاکھوں طاعتوں وعبادتوں واخلاقوں و
اعمالوں سے بہتر ہوتی ہے۔ اس واسطے دوسرے انسانوں کو مناسب نہیں ہے
کہ ان کے حق میں تعظیم وتکریم کا اعتقاد نہ رکھیں۔ اور ان کا بڑا مرتبہ سمجھیں اور ان کی
معصیت کو (جو اللہ تعالےٰ کے امر کے مقابلہ میں ہے) درجہ کمال کا خیال

کرے اور اپنی نسبت سے اعلیٰ و افضل سمجھے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے (کہ خوض کی ممانعت سے قرآن مجید میں نقص لازم آتا ہے۔ اور یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسی پہیلی ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی) تو اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی اگر قرآن مجید ایسا ہوتا جس کو ہر کس و ناکس سمجھ لیتا اور ہر درجے کا آدمی اس کی عبارت سے یکساں مطلب نکال سکتے اور ہر للو پنجو اس کی تہ تک پہنچ سکتا تو اس آیت (فَاسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ) کے فرمانے کی ضرورت نہ ہوتی اور اہل الذکر سے مراد اولیاء کرام اور علماء راسخین ہیں اور دوسرے لوگ ان کی اتباع کے واسطے مامور ہیں کیونکہ وہی وارث انبیاء ہیں اور اللہ تعالےٰ کے اسرار و حقائق کے امین و محافظ ہیں۔

اب آدم علیہ السلام کی معصیت کی کیفیت سنو۔ آدم علیہ السلام سے جو فعل سرزد ہوا۔ جب وہ اللہ تعالےٰ کے تقدیر و ارادہ سے تھا تو آدم علیہ السلام کا اس میں بلحاظ اطاعت ارادہ کیا قصور تھا۔ اسی دلیل سے جب آدم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام میں مباحثہ ہوا تھا۔ آدم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو ساکت کر دیا تھا۔ نیز اس ممنوع درخت کے کھانے سے آدم علیہ السلام کی نیت خدا کی سرکشی و ترک حرمت نہ تھی۔ بلکہ وہ فعل ایک صحیح دلیل کی تائید سے صادر ہوا تھا۔ جس کی رو سے وہ کھاتے وقت حق پر تھے۔ اس قسم کی غلطی بعض کامل عارفوں کو بھی لگ جاتی ہے یعنی جو شخص تاویل سے عاصی ہوتا ہے۔ وہ وقوع فعل کے وقت عاصی نہیں ہوتا۔ ہاں وقوع فعل اور اظہار خطا کے بعد وہ اپنے دل میں اپنی غلطی کا مقر ہوتا ہے اور اس وقت ظاہر حال سے اس پر خاطی و عاصی ہونے کا حکم لگ سکتا ہے۔ جیسا کوئی مجتہد اپنے اعتقاد میں کسی وقت کوئی فتوےٰ دے ... اور اس کو عین حکم شرع

خیال کرتا ہے - اور جب اسے کسی اور دلیل سے اپنے پہلے فتوے کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے تو اس وقت ظاہر حال میں اسے مخطی کہا جاتا ہے۔ لیکن وقوع فتویٰ کے وقت مخطی نہیں تھا - ایسی ہی آدم علیہ السلام باعتبار وقت وقوع فعل تو خاطی نہیں تھے - ہاں باعتبار وقت ظہور دلیل ثانی ظاہر میں ان پر خاطی کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے - نہ حقیقت میں - میرے آقا شیخ ابو مدین شعیب قطب ربانی شیخ العرب کا قول ہے - کہ اگر آدم علیہ السلام کو درخت کھانے کے وقت یہ خبر ہوتی کہ وہ زمین کی طرف نازل ہوگا اور اس کی پشت سے انبیاء و مرسلین پیدا ہوں گے تو وہ اسے متبرک سمجھ کر سارا درخت کھا جاتا گویا آدم علیہ السلام کی معصیت اللہ کے ارادہ کے اعتبار سے اس پر عین احسان و مہربانی تھی - یعنی ظاہر میں تو ظاہر بینوں کو معصیت معلوم ہوتی ہے - مگر باطن و حقیقت میں عین رحمت تھی اس نکتہ کو اہل سعادت ہی سمجھتے ہیں - اور اہل شقاوت کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں - اہل شقاوت کی پروانہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے - نہ اہل اللہ وہ اپنی شقاوت کی وجہ سے اسی قابل ہیں کہ ایسے نکتوں کو نہ سمجھ سکیں -

میں نے اپنے شیخ کو اس مقام کے متعلق ایک اور عجیب تقریر کرتے بھی سنا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کا ذکر بھی کروں کیونکہ اس میں آدم علیہ السلام کی توقیر و تعظیم ہے - اگرچہ اس تقریر کے سمجھنے سے اکثر لوگوں کے فہم قاصر ہوں گے - کیونکہ اس کا سمجھنا خاص محقق عارفوں کا ہی حصہ ہے - اور اسرار ازلی کے اشارات کا جاننا انہیں کا کام ہے وہ تقریر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کو اسماء کا سکھلانا اس بات کا مقتضی تھا کہ آدم علیہ السلام اس درخت کو کھاویں - کیونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ درخت کا کھانا آدم علیہ السلام کی قسمت میں ہے اور ارادہ ازلی یہی ہے - پس اگر وہ اس کو نہ کھاتے تو ارادہ

سابقہ کی مخالفت لازم آتی ہے علاوہ اسکے اس کی مخالفت ممکن بھی نہ تھی کیونکہ انسان اللہ تعالےٰ کے ارادہ کے تابع ہے۔ اور اس کے تمام افعال اللہ تعالےٰ کے ماتحت ہیں۔ اور معصیت بلحاظ امر و حکم کے ہے نہ ارادہ کے جس غلام کو یہ معلوم ہو جاوے کہ اس کے آقا کا امر اس کے ارادہ کے مطابق نہیں ہے تو وہ اس کے ارادے کی اطاعت کرے گا۔ اگرچہ فعل میں اس کے امر کی مخالفت معلوم ہوتی ہو علاوہ اس کے جب آدم علیہ السلام کو اشیار مادیہ (ہنڈی۔ برتن۔ چکی۔ چولہا۔ قبہ وغیرہ وغیرہ) کے اسمار بھی سکھائے گئے۔ تو آدم علیہ السلام نے سمجھا کہ اس درجہ تجرد و روحانیت میں جو ان کے استعمال کا محل نہیں ہے۔ اس کے سکھلانے سے یہ غرض ہے کہ مجھے عالم تجرد و عالم عقل سے عالم مادی و حالت جسمانی میں اترنا ہوگا۔ جہاں کہ ان اسمار مادیہ کے مسمیات و مصداقات کا استعمال ہو سکتا ہے۔ اس واسطے انہیں اسی وقت سے انتظاری تھی کہ دیکھئے زمین میں اترنے اور خلیفۃ اللہ بننے کا وقت کب آتا ہے۔ اور اس کے آقا کا ارادہ کب پورا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ جب فرشتوں نے میرے اور میرے اولاد کے حق میں فساد اور سفک دم (خونریزی) کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اور ان کے فخر توڑنے کے واسطے خدا نے مجھے ان کا مسجود بنایا جس سے غرض یہ تھی کہ فرشتے بھی انسان کے واسطے مسخر ہیں گے۔ اور حق عبودیت بجالاویں گے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ خدا کی ربوبیت اور انسان کی عبودیت کا تقاضا یہی ہے۔ کہ انسان میں خشوع و خضوع و انکسار و فروتنی ہو اور یہ تب ہی ہو سکتی ہے کہ انسان مراتب سفلے میں گرایا جاوے اور پھر وہاں سے ترقی کرتے کرتے اعلیٰ مراتب تک پہنچے اور لوح محفوظ کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم کر چکے تھے کہ اللہ تعالےٰ اس سے ایک مخلوق پیدا کرے گا۔ جیسا کہ خدا نے [illegible]

(جیونٹی) میں اس مخلوق کو اس کی پیٹھ سے نکال کر ظاہر کر دیا تھا۔ اور وہاں ہی اس کو محمد رسول اللہ نبیؐ کا رتبہ اور داؤد علیہ السلام کی وسعت خلافت کا حال ظاہر ہو گیا تھا۔ پھر آدم علیہ السلام نے اپنی عمر کا کچھ حصہ داؤد علیہ السلام کو بخش دیا تھا۔ یہ حالات جب اس کے سامنے پیش ہوئے تو آدم علیہ السلام کی زبان حال پکار کر کہہ رہی تھی۔ کہ ممنوع درخت کی ممانعت سے یہ مراد ہے کہ اب اس کے درجہ عبودیت و افتقار میں نازل ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔ اور آدم علیہ السلام نے خیال کیا کہ کھانے سے منع کرنا گویا اس کے کھانے کا حکم دینا ہے (اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَا مُنِعَ) گویا اس عبارت سے خدا کا مطلب یہ تھا کہ اگر تو اس درخت کو کھائے گا تو تجھ کو دار خلافت کی طرف نازل کر دونگا اور تجھے زمین میں اپنا خلیفہ بنا دوں گا۔ اور آدم علیہ السلام بھی (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) سے اس راز کو سمجھ چکے تھے۔ اور جان گئے تھے۔ کہ مجھے اب جنت سے نکل کر زمین کی طرف جانا ہوگا۔ اسی واسطے انہوں نے اس امانت (خلافت) کو (جو خدا نے پہاڑوں آسمانوں وغیرہ پر پیش کیا تھا) جھٹ قبول کر لیا اور تحمل و برداشت میں اپنا حوصلہ دکھایا۔ اور اس کے عوض میں خدا سے مدح و شاباش کا خواستگار ہوا مگر بجائے مدح کے مذمت کا مستحق ہوا اور اس کے حق میں ظَلُوْمًا جَہُوْلًا کہا گیا۔ کہ اس نے بہت جلدی سے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اپنے آقا کے سامنے اپنی مرضی سے چیز اختیار کرنے میں جاہل و نادان بنا۔ اور خدا کی رضامندی پر نہ چھوڑنے سے ان مصائب میں مبتلا ہوا۔ اور (مرضی مولا از ہمہ اولٰی) کا سبق بھول گیا۔ علاوہ اس کے آدم علیہ السلام سے وہ فعل نسیان و فراموشی کی حالت میں صادر ہوا تھا نہ عمداً و ارادۃً جیسا کہ (وَلَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ

لَہٗ عَزْمًا[1]) سے معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک شیخ کی تقریر کا مضمون ہے۔

میرے آقا قطب ربانی شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی مکالمہ سے مشرف کرنے کے واسطے زمین میں بھیجا۔ اور یہ ان کے حق میں ترقی کی حالت تھی۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ ترقی کرتے رہتے ہیں لیکن یہ ترقی کبھی تقریب و تخصیص سے ہوتی ہے۔ اور گاہے تذلل و مسکنت سے اور یہ درجۂ افتقار و عبودیت حقیقت میں اعلیٰ مرتبہ ہے۔ کیونکہ عبد کی صفت خاص یہی ہے۔ اور آدم علیہ السلام کو اس وجہ سے دو درجہ عبودیت حاصل ہوئے۔ (۱) درجہ عبودیت معرفت سابق (۲) درجہ عبودیت تکلیف لاحق اور اس سے آدم علیہ السلام پر خدا کی بڑی رحمت و شفقت ہوئی۔ گویا آدم علیہ السلام کا درخت کے کھانے میں جلدی کرنا اللہ کے ارادہ سابق کی حصول کے لئے تھا مگر چونکہ وہ کام اذن صریح سے پہلے تھا۔ اس واسطے ظاہر میں قابل اعتراض و لائق عتاب ہوگیا۔ اور حکمت الٰہیہ اس کے مقتضی نہ تھی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ فحشاء و منکر کا حکم نہیں دیتا اور اللہ اپنے فضل و کمال کے اظہار کے واسطے انسان پر اتمام حجت کر دیتا ہے۔ اور اس کی شان اسی لائق ہے کہ اس سے ہمیشہ صفات خداوندی و احکام حاکمانہ صادر ہوں۔ کیونکہ عبد کا درجہ یہی ہے کہ ہمیشہ اس کے قہر و جلال کے ماتحت رہے اسی واسطے آدم علیہ السلام کی زبان سے یہ کلمات عبودیت صادر ہوئے (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ[5]

---

[5] اے رب ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ پس اگر تو نہ بخشتا اور رحم نہ کرتا تو ہم نہایت ہی خسارہ اٹھاتے۔

[1] ہم نے اس سے پہلے آدمؑ سے ایک وعدہ لیا تھا۔ مگر وہ بھول گیا اور اس کا ارادہ نہیں تھا۔

تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ) حالانکہ جانتے تھے کہ جو کچھ مجھ سے صادر ہوا ہے اس کی قضاء مبرم اور تقدیر غالب کے تقاضا سے ہوا ہے۔ کیونکہ ادب اسی میں ہے۔ اور آقا و غلام کی محبت اسی طرح معلوم ہوتی ہے کہ غلام آقا کے حکم کے سامنے چون وچرا نہ کرے اور اگر خداوند تعالیٰ معصیت و مخالفت کو بندوں کی طرف منسوب نہ کرتا تو اس کی حجت اُن پر پوری نہ ہوتی ابلیس کے قصہ میں غور کرو کہ وہ فقط بے ادبی و گستاخی سے راندہ گیا شیطان نے خدا کو کہا تھا۔ کہ مجھے آدمؑ کے سجدے کے واسطے کیوں کر حکم دیتا ہے۔ حالانکہ تیرا ارادہ یہ نہیں ہے۔ اگر تیرا ارادہ ہوتا تو میں ضرور کرتا۔ دیکھو کہ اس گستاخی و سوء ادب سے لعنت کا طوق اس کے گلے میں ڈالا گیا۔ ذرا ان میں غور سے کام لینا چاہیئے۔ ایسا ہی یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بھی خوض نہیں کرنا چاہیئے اور (لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ) کے معنے یہ ہیں کہ زلیخا یوسف علیہ السلام کو اپنے ارادہ پر مجبور کرنا چاہتی تھی اور (وَهَمَّ بِهَا) کے یہ معنے ہیں کہ یوسف علیہ السلام زلیخا کو اس کے ارادہ کے ٹالنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ گویا ہر دو ایک فعل میں شریک تھے اور دلیل اس کی زلیخا کا یہ قول ہے (اَلْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ) اب حق ظاہر ہو گیا میں نے ہی درخواست کی تھی اور یوسفؑ کے حق میں (اِنَّهٗ رَاوَدَهَا عَنْ نَفْسِهَا) نہیں آیا۔ کہ اس نے اس سے درخواست کی تھی۔

شیخ فخرالدینؒ[1] رازی نے اس مقام کو بڑے بسط و شرح سے لکھا ہے۔ جو شخص اشتیاق رکھتا ہو اس کا مطالعہ کرے۔ کوئی عارف کشف کے ذریعہ سے

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل تفسیر کبیر کا اردو ترجمہ منگا کر دیکھو۔

یوسف علیہ السلام سے ملا۔ اور اس کو اس تاویل کی خبر دی تو انہوں نے کہا کہ تو نے سچ کہا ہے یہی اللہ کی مراد ہے۔ جاننا چاہیئے کہ جو کچھ اولیاء کو بطریق کشف معلوم ہوتا ہے اس میں اللہ کی تعظیم وادب ہوتا ہے۔ اور ان کا وہ کام انبیاء کی تابعداری سے باہر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے کاموں سے انبیاء کی عظمت وشان ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس امت میں اگرچہ شرع وملت جدیدہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن اس کے معارف ودقائق کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اور کشف والہام سے احکام شرعیہ کی عزت وشوکت زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ لیکن کشف والہام سے احکام شرعیہ (فرائض۔ حلال۔ حرام۔ اور امر ونواہی وغیرہ) ثابت ومتجدد نہیں ہوتے کیونکہ اگر یہ دروازہ کھل جاتا تو احکام شرعیہ آپس میں متخالف ہو جاتے اور بباعث کثرت مدعیان شریعت کا نظام بگڑ جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ آیات متشابہات کی اصل حقیقت سمجھنے والے عرفاء کامل ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب انہیں کسی امر منقول میں شک پڑتا ہے۔ تو کشف صحیح کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور وہ کشف کتاب وسنت کے مخالف نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ اللہ ان پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ کتاب وسنت کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ولی کا دعویٰ نبی کی شریعت کی تنسیخ کا نہیں ہوتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہوتی ہے کہ ولی شریعت کے اجزاء متفرقہ کو ملا کر ایک ایسی ترتیب سے جمع کرتا ہے کہ ایک نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کی نظیر بحیثیت مجموعی شرع میں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ اس کے افراد واجزاء کے اعتبار سے وہ امر مشروع ہوتا ہے اور وہ اس کام سے شرع سے خارج نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ شارع سے اس قسم کی ترتیب کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ (مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً"

فَلْیُحْسِنْ کُفْنَہٗ[1]) اس کی مؤید ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ان کو ترتیب کی ترکیب کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ اصول شرع کے مخالف نہ ہو۔ اور انبیاء کے نکات کو سمجھنا اولیاؤں کا ہی حصہ ہے۔ ایسے ہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو کذب کی طرف منسوب کرنا اور سیدنا لوط علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے حق میں ایسی باتوں کا منسوب کرنا جس سے ان کی ذات پاک منزہ و مبرا ہے۔ خلاف ادب ہے۔ اور ناقص الفہم لوگ ان کی حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ چونکہ اس مقام میں ان باتوں کا ذکر ہمارا مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس واسطے ہم اس بحث کو یہاں ہی چھوڑتے ہیں کیونکہ اس صورت میں رسالہ کے طویل ہونے کا خطرہ ہے۔ اور اس تھوڑی سی تقریر سے سمجھنے والا بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور ناسمجھ و غور نہ کرنے والے کے لئے تفصیل و تشریح بھی بیکار ہے۔ **دیگر** علامت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شارع و مجتہد و قت کا مقلد رہتا ہے۔ حکم شرعی کی علت اور اس حکم اور دوسرے حکم کا فرق نہیں پوچھتا۔ کیونکہ ان احکام کا علم ازمنہ متعددہ سے اپنی نہایت کو پہنچ گیا ہے اور اس زمانہ کے سمجھنے والوں کی غایت یہی ہے کہ وہ متقدمین کے اقوال کو سمجھیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ جس عمل کی شارع نے علت بیان نہیں کی وہ محض عبادت کی خاطر ہوتا ہے۔ اور عبادت بلا معرفت علت اس عبادت سے اچھی ہے جس کی وجہ و حکمت معلوم ہو۔ کیونکہ عمل کی جب حکمت معلوم ہو جاتی ہے۔ تو وہ کام اس حکمت کے واسطے کیا جاتا ہے۔ اور جب حکمت و علت معلوم نہیں ہوتی اس وقت اس عمل کا باعث محض عبادت ہوتی ہے

---

[1] جو کوئی اچھا طریقہ ترکیب دے سکے تو کرے۔

نیز احکام کے علل و فروق (جمع و فرق) سے بحث کرنا عبد کامل کا کام نہیں ہے کیونکہ وہ مامورات کے بجالانے اور منہیات کے ترک کرنے کے واسطے مکلف ہے ۔ نہ علتوں اور فرقوں کے معلوم کرنے کے واسطے کیونکہ وجوہات و حکم جاننا عمل کے لئے شرط نہیں ہے ۔ نیز ہر وقت ان باتوں کا خیال رہنا تضییع اوقات ہے ۔ اس بحث کے بعد بھی اگر وہ کسی خاص امام کا مقلد ہے تو وہ اپنے ہی امام کے کلام کی طرف رجوع کرے گا ۔ کیونکہ وہ منقول کی مخالفت کر نہیں سکتا ۔ اور اس حالت میں اپنی عبادت کو باطل سمجھتا ہے ۔ پس جو مقلد یہ بات سمجھ لیتا ہے وہ تمام جھگڑوں و اشکالوں سے چھوٹ جاتا ہے ۔ اور اس کی تمام فقہ بغیر اعتراض کے ہو جاتی ہے ۔ اور تمام لا بلا بگردن ملا پر چھوڑ دیتا ہے ۔ پس اس تقریر سے صاحب عقل نتیجہ نکال سکتا ہے ۔ کہ ساری عمر علوم ظاہریہ میں صرف کرنی منزل مقصود تک نہیں پہنچا دیتی ۔ کیونکہ یہ علوم حواس سے تعلق رکھتے ہیں اور حواس میں مکابرہ و مجادلہ کا بڑا دخل ہے ۔ اور علم حقیقی کا تعلق دل سے ہے جو بغیر ریاضت و مجاہدہ حاصل نہیں ہوتا ۔

دیگر علامت یہ ہے ۔ کہ وہ تکبر نہیں کرتا اور اس کو اپنی حکمت اور وسیع واقفیت پر غرور نہیں ہوتا ۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے ۔ اس کی خشیت و خوف بڑھتا جاتا ہے ۔ علاوہ اس کے جو شخص فخر کرتا ہے وہ ناقل و طوطا ہوتا ہے نہ عاقل و عالم کیونکہ جس کا علم غیروں کے الفاظ کا مجموعہ ہو اور تقلیداً حاصل کیا ہوا ہو وہ علم نہیں ہے ۔ علم وہ ہے جو اس سرچشمہ سے لیا جاوے جس چشمہ سے اس کے مقتدا نے پانی پیا تھا ۔ اس چشمہ سے یہ بھی پانی پیئے اور جس کو علم کا چشمہ معلوم ہو جاتا ہے وہ اس ظاہری نقلی علم پر فخر نہیں کرتا ۔ نیز علم حقیقی کی علامت یہ ہے کہ کسی مشکک کے شک سے زائل نہ ہو جاوے

اور عین واقع کے مطابق ہو جس کا علم اس درجہ کا نہیں ہے۔ وہ علمارِ عارفین کے درجہ سے کوسوں دور ہے۔ بلکہ وہ ناقل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ محض طوطے کی طرح بولتا ہے اور اس کی حقیقت نہیں سمجھتا۔ علاوہ اس کے اس قسم کا علم عالمِ برزخ میں اس کے کچھ کام نہیں آتا۔ کیونکہ اس کا تعلق دنیا اور جوارح سے تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ علم مفید وہ ہے جس کا تعلق دل سے ہو اور وہی برزخ میں ساتھ رہتا ہے اور آخرت میں کام آتا ہے اور جو علم ساتھ رہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات وسنن وآداب۔ اور اس کی مصنوعات کا علم ہے دیکھو کہ نزاع کے وقت علوم ظاہریہ وفنون دنیویہ کی طرف میل ورغبت نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس وقت اس پر اصل حقیقت کھل جاتی ہے اور نظر باطن تیز ہو جاتی ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا علم آخرت کے واسطے مفید ہے۔ اور اس وقت اس پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ جس علم کا تعلق دل سے ہے وہی آخرت میں مفید ہے۔ اور علوم ظاہری صرف ونحو۔ ولغت یہاں کام نہیں آتے۔ جیسا عالم ظاہری کا حال بباعث انکشاف کے روح کے نکلنے کے وقت ہوتا ہے۔ علمار باطنی کا حال بر وقت زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے ہر لحظہ میں وہی علم حاصل کرتے ہیں جن سے تزکیہ نفس وصفائی قلب حاصل ہوتی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ علوم ظاہریہ جو لوگوں کے ہاتھ میں ہیں وہ اولیار کے سمندر کے سامنے ایک قطرہ بھی نہیں ہیں۔ یہ بات ہماری کتاب (تنبیہ الاغبیار علٰے قطرۃٍ مِن بحرِ عُلُومِ الاَولِیَاءِ) کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ میں بھی اس ذوق سے پہلے خیال کیا کرتا تھا کہ علم تو علم ظاہری اور منقولی ہی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے ان علوم کے بجائے مجھ پر قرآن مجید وحدیث کے معانی ودقائق

کا دروازہ کھول دیا۔ پھر میں نے لوگوں کے علوم ظاہریہ کو اس دریائے محیط کے مقابلہ میں قطرہ بھی خیال نہ کیا (فالحمد للہ علی ذالک اور ما اوتیتم من العلم الا قلیلا" کا دروازہ کھل گیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی علوم باطن کے جاننے سے کہا تھا کہ میں حرف بار کے معنے سے (اونٹ کی بوری کے برابر معانی نکال سکتا ہوں یہ سچ ہے (جمیع العلم فی القرآن جمع۔ تقاصر عنه افہام الرجال)

دیگر علامت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ قرآن مجید یا حدیث شریف وغیرہ مطالعہ کرتا ہے۔ اگر کوئی مقام اُس کے فہم سے باہر ہو تو دوسرے سے پوچھ لیتا ہے اور اپنے دل کو بھی صاف کرتا رہتا ہے۔ اور جب دل تقویٰ سے آراستہ ہوجاتا ہے اور زنگ کدورت دہوا دہوس سے پاک ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اُس کا معلم ہوجاتا ہے۔ پھر اُسے فہم قرآن مجید و حدیث شریف میں چنداں دقت نہیں ہوتی۔ میں علوم فقیہہ کے تحصیل کے زمانہ میں جب کسی مسئلہ میں متردد ہوتا تو ایک اُمّی شخص سے جو علوم ظاہریہ سے بالکل واقف نہ تھا۔ پوچھا کرتا۔ اور وہ ایسا عمدہ جواب دیتا کہ میرے اعتراض رفع ہوجاتے اور میں ان کے جوابات اپنے ذکریا کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ ان کو بہت پسند فرماتے اور اپنی کتابوں میں شامل کرنے کا حکم دیتے۔ اُس سے معلوم ہوا کہ علم باطن رکھنے والا جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے بہ نسبت فقیہہ و متکلم کے جو عمل نہ کرے اچھا ہے وجہ یہ ہے کہ فقیہہ و متکلم اپنے اعمال کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور اپنے اعمال کے ثواب کے طالب ہوتے ہیں اور بلا غرض و خالصاً لوجہ اللہ و اخلاصاً لله مراللہ اور بے غرض کوئی کام نہیں کرتے۔ اور فقیر ہر چیز کا فاعل اسی کو سمجھتا ہے اور اپنے اعمال سے کسی ثمرہ کا طالب نہیں ہوتا۔ پس جب فقیہہ متکلم میزان پکڑے ہوئے خدا تعالےٰ کی درگاہ میں جاتے ہیں تو وہاں سے رد کے جاتے

ہیں اور ادب کی رعایت نہ کرنے سے محروم رہتے ہیں اور علم لدنی کے فیض سے خالی رہتے ہیں۔ اگر کوئی ان میں صاحب عقل ہوتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی درگاہ میں بلا میزان و مطالبہ جاتا ہے۔ اور میزان کو دروازہ پر چھوڑ جاتا ہے۔ اور جب آتا ہے تو اس کو للّٰہ (بلا غرض) وزن کرنے کے لئے اٹھاتا ہے۔ نہ علی اللہ (مطلب و غرض کے واسطے) وزن کرنے کے اور یہ درجہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ باتیں صرف تختی پر بہ نسبت صاف کی ہوئی تختی کے جلدی نقش ہوتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ جب میں نے قوم (صوفیاء کرام) کا راستہ لیا اور اپنے دل کو فارغ کر کے ذکر و فکر میں معروف ہوا اور چالیس روز اسی شغل میں رہا تو میں نے خیال کیا کہ مجھ میں قوم (اہل اللہ) کی سی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن میں نے غور کیا ہے تو معلوم ہوا کہ ابھی قوت فقیہ باقی ہے۔ پھر میں بار بار مجاہدہ میں مصروف ہوا۔ لیکن حال ویسا ہی رہا۔ اور اہل اللہ کی سی کوئی کیفیت مجھ پر طاری نہ ہوئی۔ اس سے میں نے نتیجہ نکالا کہ جیسا بالکل صاف تختی پر نقش ہوتا ہے ویسا محو شدہ پر نہیں ہوتا اور جو اثر تربیت کا تر لکڑی قبول کرتی ہے وہ خشک نہیں مانتی۔ سچ ہے ؎

چوب تر را چنانکہ خواہی پیچ   نہ شود خشک جز بآتش راست

جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالے جب کسی بندے کو عمل کی توفیق دیتا ہے تو اس سے پہلے اس کے متعلق علم کی سمجھ عطا کرتا ہے جو اس عمل کا موقوف علیہ ہے کیونکہ عمل کسی چیز کا اس کی حقیقت جاننے کے بغیر نہیں ہو سکتا اور اس فہم سے مراد صرف معانی کلام کی سمجھ ہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ ساتھ اس کے صفائی باطن و پاکیزگی قلب بھی شامل ہے۔ دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر اہل اللہ کے کسی کلام کو (جو ذوق و معاملہ سے تعلق رکھتی ہے اور عقل کی حد سے

متجاوز ہے) سنتا ہے تو اس کے انکار میں جلدی نہیں کرتا۔ بلکہ جہاں تک ہو سکتا ہے اس کی تاویل کر کے موافق ظاہر شرع بنا لیتا ہے۔ بعض صوفی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے کلام زیادہ تاویل کے محتاج نہیں ہوتے۔ شیخ الاسلام ذکریا و شیخ عبدالرحیم الانباسی اسی زمرہ میں ہیں۔ اور بعض اہل اللہ کے کلام نہایت ادق و قابل تاویل ہوتے ہیں۔ حضرت ابو یزید بسطامی اور شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ کے کلام اسی قبیلہ سے ہیں۔ حکایت ہے کہ ابو یزید بسطامیؒ نے ایک دفعہ سبحان اللہ کہا۔ خدا نے اسے پوشیدہ کہا کیا تو مجھ میں کوئی نقص پاتا ہے کہ مجھ کو اس سے پاک کرتا ہے۔ جواب دیا کہ نہیں عیب تو کوئی نہیں پاتا خدا نے کہا کہ پھر اپنے نفس کو پاک کر۔ پھر وہ اپنے باطن کی صفائی میں مشغول ہوئے یہاں تک کہ کوئی ایسا عیب نہ رہا جو خدا تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو۔ پس جب پاک ہو چکے تو فرمایا سبحانی (یعنی میں پاک ہوں) پس ایسے الفاظ کی جو تاویل نہ کرے اور ان کو خلاف شرع سمجھے اس کی عقل پر بڑا افسوس ہے حالانکہ وہ خداوند کریم کے کلام کے باوجود کمال ہونے کا کرتا ہے۔ اور بندہ کے کلام کے باوجود عاجز و ناقص ہونے کے تاویل نہیں کرتا۔ پس پتھر پڑیں ایسی عقل و سمجھ پر۔ **دیگر** علامت اس کی یہ ہے کہ وہ اپنے امام کی (اگر اس کا قول اسے ضعیف معلوم ہو اور اس کی دلیل کی کمزوری معلوم ہو جاوے اور دوسرے مذہب کی دلیل قوی معلوم ہو) بیجا تائید نہیں کرتا اور تعصب و بیجا حمایت کے گڑھے میں نہیں گرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے امام نے یہ نہیں کہا ہوا کہ ہر امر میں میری تقلید کیجئو۔ کیونکہ امام خود سمجھتا تھا کہ میرا ہر قول خطا سے پاک نہیں ہو سکتا۔ امام مالک امام المدینہ کا قول ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سوا ہر شخص کے کلام قابل تردید لائق

انکار ہو سکتی ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی اپنی اور غیر کی تقلید سے منع کیا ہوا ہے چنانچہ ان کے کلام کا مضمون یہ ہے کہ صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے۔ جب تم میرے کلام کو سنت کے مخالف دیکھو تو سنت پر عمل کرو اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔ اور حقیقت میں شافعی رحمۃ اللہ کا کوئی مذہب نہیں ہے وہ ایک شریعت ہے اور جو دلیل مذہب غیر میں صحیح ہو اور اس کے نزدیک صحیح نہ ہو تو عملی طور پر صحیح دلیل ہی اس کا مذہب ہے۔ بعض حنفیوں نے (فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِنْهُ) یعنی مسئلہ تیمم میں کہا ہے کہ مذہب امام شافعی اس مسئلہ میں درست ہے۔ یعنی گرد و غبار پتھر پر تیمم کر لینا جائز ہے اور حنفیہؒ کے نزدیک ایسے پتھر پر جائز نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے روایت ہے انہوں نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم پر میرے کلام سے فتویٰ دینا حرام ہے جب تک کہ میری دلیل و اصول نہ جان لو۔ پس معلوم ہوا کہ ایسی حالت میں اپنے امام کے بے محل حمایت کرنے والا اس کا مخالف ہے نہ متبع نیز کیا ضرور ہے کہ جو مقلد شخص کسی مجتہد کے کلام سے سمجھا ہے وہی اس کی مراد ہو۔ یہی تو وجہ ہے کہ مجتہدین کے کلام کے سمجھنے میں مختلف طریقے ہو گئے ہیں حالانکہ اصول سب یکساں تھے۔ واقعی جو شخص قواعد اور اصول کو چھوڑ دیتا ہے خطا میں پڑتا ہے۔ اور بباعث عدم واقفیت اصول ایک مجتہد کا مقلد کو خالی اور غلطی پر بتلاتا ہے۔ اگر اصول کو جانتے اور سمجھتے کہ منزل مقصود ایک ہے صرف راستے مختلف ہیں تو اس اختلاف میں نہ پڑتے اللہ اس امت پر رحم کرے کہ دین سے کیسی بے خبر ہو گئی ہے۔ اور اس کے اصول و قواعد کے سوچنے میں کیسی کاہل ہو گئی ہے۔ بس عقلمند کو چاہیئے کہ تعصب سے بچے اور جان لے کہ مجتہدین کے تمام مذاہب اہل عقل کے نزدیک

ایک ہی ہیں اور وہ اپنی وسعت نظر کے سبب ان میں کوئی تفرقہ و اختلاف نہیں دیکھتے۔ کیونکہ وہ اس چشمہ کو دیکھتے ہیں جس سے مجتہدین نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اور تمام مذاہب کو ایک ہی شریعت کی شاخیں دیکھتے ہیں (اور ہم نے بھی اس راز کو پایا ہے اور اس کا ذائقہ چکھا ہے۔ وَالحَمدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

اہل ذوق مذاہب مشہورہ میں سے کسی مذہب کے پابند ہونے کا حکم نہیں کرتا۔ کیونکہ تمام مذاہب ان کے اندر ہیں اور اس امر کو فقرار اہل ذوق ہی سمجھتے ہیں اور ان کا ذوق تمام مجتہدین کے ذوق کے برابر ہوتا ہے فقرار اہل ذوق کا علم اس قدر وسیع ہوتا ہے۔ کہ ان کو کسی مذہب میں مقید ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور جہلار از روئے مذمت کے ان کے حق میں یوں کہتے ہیں کہ یہ لوگ کسی مذہب کے مقید و معتقد نہیں ہوتے۔ لیکن وہ بیچارے اندھے ہونے کی وجہ سے معذور ہیں۔ اور ان کی قدر و منزلت سے ناواقف۔ کیونکہ وہ ایسے اعلیٰ منازل پر ہوتے ہیں کہ جہلار ان کے مراتب کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اور شریعت صحیحہ تو نہایت آسان ہے۔ جس میں کوئی مشقت و تکلیف نہیں ہے۔ پس علمار انہیں تمام مذاہب کے اقوال مختلف کو ایک ہی مذہب خیال کرتے ہیں اور ان کے فروعی اختلاف کو مختلف حالات و اعتبارات پر محمول کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ مقتضائے عقلمندی و قاعدۂ حکمت یہی ہوتا ہے کہ ایک ہی سوال کا جواب مخاطبین مختلف الاستعداد کے واسطے مختلف ہوتا ہے۔ اور مقصود بالذات و اصل الاصول سب مختلف جوابوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی قاعدہ تھا۔ جیسا کہ حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اور (اُمِرتُ[1]

---

[1] میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے اندازہ سے گفتگو کروں۔

اَنْ اُخَاطِبَ النَّاسَ عَلٰے قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ) سے اسی طرف اشارہ ہے۔ پس
اس سے معلوم ہوا کہ مذاہب کے درمیان تناقض و تخالف اس کو معلوم ہوتا
ہے۔ جو عارف علماء کے درجہ سے قاصر ہے اور اسرار شرعیہ سے جاہل ہے
دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ کسی متکلم (خواہ نبی ہو یا ولی یا عالم) کے
کلام کا حصر ایک ہی مراد پرنہیں کرتا کیونکہ غیر کی کلام کا ایک ہی معنے پر حصر کرنا
بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ ہر مخاطب ہر متکلم کے کلام سے اپنے لیاقت و استعداد
کے موافق معنے اخذ کرتا ہے۔ اور ہر ایک شخص درجہ استعداد میں مختلف ہوتا
ہے دو فرد بھی ایسے نہیں پائے جاتے جو ایک درجۂ لیاقت و استعداد میں
مشترک ہوں کیونکہ ہر ایک چیز (خواہ حسی ہو یا خیالی یا وہمی یا عقلی) کے مدارج
و مراتب بیشمار و لاانتہا ہوتے ہیں اس واسطے عقلمند کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ
کہتا ہے کہ میں قائل کے قول کا یہ مطلب خیال کرتا ہوں نہ یہ کہ جو کچھ میں سمجھا ہوں
وہی متکلم کی مراد ہے۔ اور وہ اپنے خیال پر اصرار نہیں کرتا۔ اور جو شخص اس
کے برخلاف چلتا ہے اُسے عقلمندوں کی مجلس میں نہایت ندامت اُٹھانی
پڑتی ہے اور اس پر حق کو ایک ہی مذہب میں محصور کرنے کا الزام عائد ہوتا
ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ کسی زبان کے الفاظ کے معانی سمجھنے سے یہ مراد
نہیں ہوتی کہ متکلم کے کلام کے الفاظ کے معنی اس زبان کے محاورہ کے مطابق
سمجھ لے۔ بلکہ کلام سمجھنے کے یہ معنے ہیں کہ متکلم کی مراد و مقصود کو سمجھے اور اس
کے موقع و محل کو جانے کہ متکلم نے وہ کلام کس غرض کے واسطے کہی تھی۔ اصلی
حقیقت کلام کی یہی ہے کہ متکلم کی غرض سمجھی جائے نہ اس کا لفظی ترجمہ اور متکلم
کی اصلی منشاء کو وہی جانتا ہے جس کے دل پر قرآن شریف اترتا ہے۔ اور
کلام کے معانی جو اس کے الفاظ سے ثابت ہوتے ہیں ان کا سمجھنا عوام کا کام ہے

عوام الناس جو عارفوں کے کلام کا مطلب سمجھتے ہیں وہ صرف کلام کا سمجھنا ہے نہ
متکلم کے منشار کا سمجھنا۔ اور متکلم کی یقینی مراد وہی سمجھ سکتا ہے۔ جو متکلم کے منشار
سے واقف ہو۔ اس محل کو ذرا غور و فکر سے مطالعہ کرنا چاہیئے کہ نہایت دقیق
ہے۔ اور امید کہ یہ مضمون کسی اور کتاب میں نہیں ملے گا۔

ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ جب کسی درجہ کا انسان اپنے سے اعلیٰ درجہ
کے انسان کے کلام کے احاطہ سے عاجز ہوتا ہے تو ہر ایک شخص کا یہ دعویٰ
کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خداوند تعالےٰ کے کلام کو سمجھ سکتا ہے۔ اور
اس کو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ کلام اللہ کی تفسیر کرنے لگے۔ کلام اللہ کی
تفسیر کرنا صرف کامل عارفوں کا حق ہے۔ کیونکہ وہ اسرارِ شریعت سے
واقف ہوتا ہے اور ان کے نفوس ہوا و ہوس و شکوک و ظنون و اوہام
باطلہ و دعاوی کاذبہ سے پاک ہوتے ہیں اور معارف عالیہ و حقائق غالیہ
سے معمور ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس درجہ تک نہیں پہنچے ان کا کام صرف
یہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اللہ کے بندے کہلائیں۔ اور صرف علم توحید پر
بس کریں اور عمل کے واسطے صرف اللہ کی محبت اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی محبت اور اعتقادِ حق کو کافی سمجھیں۔ اور تفسیر
کا دم نہ ماریں۔ ایسے لوگوں کے حق میں تقوےٰ و پرہیزگاری ہی اچھی ہے نہ کہ
علم و معرفت حقائق۔ کیونکہ حقیقی علم و معرفت کا درجہ (جس میں انسان تفسیر کے
لائق ہو سکتا ہے) بہت دور ہے اور اس درجہ تک پہنچنے والے ہمیشہ شاذ و نادر
ہی ہوتے ہیں باقیوں کے واسطے اتقا ہی بہتر ہے۔ جیسا کہ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ
عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ) (جو متقی ہے وہ خدا کے نزدیک شریف ہے) سے ثابت
ہوتا ہے اسی طرح اکثر آیات قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان سے حرف

عمل ہی پوچھا جائے گا۔ جیسا کہ آیت ذیل (ھَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ جَزَاءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ جَزَاءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ) سے معلوم ہوتا ہے۔ اور کسی آیت میں جَزَاءً بِمَا کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ نہیں آیا۔ اس کے علاوہ کتابوں اور رسولوں کے انزال سے بھی علت غائی امر معروف و تاکید عمل ہے اور جو شخص عالم ہو کر عمل نہیں کرتا اس کے توبیخ و زجر کے واسطے یہ آیت (مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰاۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا) کافی ہے پس اہل اللہ جانتے ہیں کہ علم و تلاوت قرآن شریف سے مراد محض الفاظ کا رٹنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کے دل میں خوف پیدا ہو اور زجر و توبیخ کے مواقع کو سمجھے اور اپنے باطن کو صاف کرے۔ اور جانتے ہیں کہ جو بات ہم جانتے ہیں اگر اس پر عمل نہ کریں گے تو پوچھے جاویں گے۔ جاننا چاہیئے کہ دل میں وہی بات اثر کرتی ہے جس کا علم اصلی ہو نہ کہ محض صورت و الفاظ مثلاً اگر کوئی بادشاہ بازاریوں کی طرح لباس پہنکر بازار میں پھرے اور لوگ اس کی حقیقت سے واقف نہ ہوں کہ وہ بادشاہ ہے۔ تو کوئی اس کی تعظیم کو نہ اٹھے گا۔ اور ان کے دلوں میں اس کی کچھ قدر و وقعت نہ ہوگی۔ لیکن جب انہیں معلوم ہو جاوے کہ یہ بادشاہ ہے تو سب استقبال کو اٹھیں گے اور خشوع و خضوع کریں گے۔ اور آنکھیں نیچی کرلیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ عزت و تکریم اس کی صورت و ظاہر ہیبت سے نہیں ہوئی۔ اگر صورت و ظاہری ہیبت سے عزت و حشمت کا تعلق ہوتا۔ تو اس حالت میں بھی ہونی چاہیئے تھی۔ جب کہ ان کو اس کی نسبت

لہ ترجمہ: تم کو انہی کا بدلہ دیا جائے گا۔ وہ اپنے عمل و کسب کا بدلہ پائیں گے۔

تہ جو لوگ توراۃ پڑھ کر عمل نہیں کرتے ان کی مثال کتابیں لدے ہوئے گدھے کی طرح ہے

(سلطنت) کا علم نہ تھا۔ اور جب یہ توقیر و تعظیم اس نسبت و حالت کے جاننے سے ہوئی تو معلوم ہوا کہ خوف و ڈر و عزت و توقیر کا تعلق علم سے ہے نہ ظاہری صورت سے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے دل پر قرآن کی تلاوت سے خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں زجر و توبیخ و مواعید و مواثیق کے مطالعہ سے تر ہو جاتی ہیں اسی کے دل پر اللہ کی عظمت کا اثر ہوتا ہے۔ فرض کرو دو شخص قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ایک تو اس کے مضامین اور اس کے اسرار و حقائق سے متاثر ہو کر خشوع و خضوع کے دریا میں ڈوبا ہوا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہا رہا ہے۔ دوسرا صرف الفاظ کی کھینچ تان میں غرق ہے اور ان معانی و معارف سے اندھا ہے۔ قرآن اس کے حلق سے تجاوز نہیں کرتا اس کے دل پر تلاوت کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ کیا یہ ہر دو نتیجہ میں مساوی ہیں ہرگز نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ظاہری الفاظ کی صورت کا بغیر فہم معانی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میں نے جب یہ مزا چکھا تھا تو میں بباعث ان امور و حالات کے جو اس درجہ میں اہل ذوق پر وارد ہوتے ہیں قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا نہ نماز میں نہ کسی اور موقع پر۔ تلاوت کے وقت میری گھگھی بندھ جاتی۔ اس حالت کو اہل ذوق ہی جانتے ہیں۔ اور جنہوں نے یہ مزہ نہیں چکھا وہ اس سے معذور ہیں اور حقیقت کے نہ سمجھنے میں مجبور ہیں۔ اہل اللہ کو حروف کے بڑھاؤ گھٹاؤ اخفاء و اظہار وغیرہ امور قرأت سے (جن کے ادا کرنے میں قاری بڑا مبالغہ و الحاح کرتے ہیں) چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی نظر حسن باطن پر ہوتی ہے نہ حسن ظاہر پر۔ اسی واسطے وہ قرأت کی مختلف روایات اور ان کے طریقوں کی تحصیل میں مصروف ہو کر تضییع اوقات نہیں کرتے بلکہ اور عمر عزیز کو لایعنی امور میں تلف کرنا سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی [illegible]

ظاہریہ کے عاشق نہ تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قرآن عربی ہے اور عرب کی لغت وسیع ہے۔ کوئی قبیلہ کسی لفظ کو مد سے پڑھتا ہے۔ دوسرا اسی کو قصر سے ادا کرتا ہے۔ کوئی اظہار کرتا ہے۔ کوئی اخفا۔ کوئی تفخیم سے ادا کرتا ہے کوئی ترقیق سے اس واسطے وہ صرف ایک لغت کے متابعت کر کے باقی بکھیڑوں میں عمر ضائع نہیں کرتے تھے۔ بلکہ گوہر مقصود کو ہاتھ میں لانے کے لئے کوشش کرتے تھے۔ اور علم کے دریا میں غوطہ زن ہوتے تھے اور ساتھ ہی صوم و صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ و زہد و پارسائی، خوف و پاکدامنی وغیرہ اعمال صالحہ میں بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ پچاس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے رہے۔ ایسا ہی ہر ایک امام صرف حفظ مسائل کو ہی کافی نہ سمجھتا تھا۔ بلکہ اوراد و اذکار وغیرہ عمل صالحہ بھی بجالاتا تھا۔ جو شخص اپنی عمر علم قرأت اور اس کے وجوہ اظہار وغیرہ صفات و امور متعلقہ حروف میں ضائع کرتا ہے۔ اور قرآن کے مقصود بالذات و مطالب و مواعظ و تہدید و توبیخ وغیرہ اسرار حقہ و دقائق عمیقہ میں غور نہیں کرتا۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے کہ بادشاہ اس کی طرف اپنے اوامر و نواہی کا دستور العمل بھیجے اور وہ اسے لے کر چومے اور آنکھ پر رکھے اور اس کے الفاظ پر فدا ہو لیکن ان اوامر کو بجا لاوے اور نواہی سے باز نہ آئے۔ تو کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ایسا شخص بادشاہ کا متبع ہے۔ اور کیا بادشاہ اس کے ان افعال ظاہریہ پر خوش ہوگا۔ اور کیا ایسا شخص بادشاہ کا مقرب ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں اور یہ اس کے افعال بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوں گے۔ اور جو شخص علم کو اس خاطر سے حاصل کرتا ہے کہ وہ اس کے معاش کا ذریعہ ہے اور الفاظ دینی حاصل کر کے لوگوں کے زکوٰۃ و صدقات

وغیرہ میلوں اور کدورتوں سے پیٹ بھرے وہ شخص دنیا میں بھی ذلیل ہوتا
ہے۔ اور آخرت میں بھی اس کے اعمال باطل ہوتے ہیں۔ اس سے تو یہ بہتر ہے
کہ کسی صنعت و حرفت کو ذریعہ معاش بنائے اور لوگوں کے ہاتھوں کی طرف
نہ دیکھے۔ علم دین سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جو کسی حرفت کو ذریعہ معاش
بنا کر علم دین کو محض علم و عمل کے واسطے حاصل کرے ورنہ جو شخص اس کے
برخلاف چلتا ہے۔ اور الفاظ کی تحصیل میں عمر ضائع کرتا ہے۔ اور اس کے
واسطے جو مصائب و تکالیف اٹھاتا ہے وہ سب اکارت و بے ثمرہ جاتے ہیں
اور اس کے تمام اعمال و افعال و اوقات باطل ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال
اس شخص کی طرح ہے جو اجڑے و ویران شہر میں رہے جہاں کوئی فرد بشر
نہ ہو اور وہ ہمیشہ اس خیال سے روٹیاں پکائے اور اس کے واسطے تکلیف
اٹھاوے کہ کوئی آکر اس کی روٹیاں خریدے گا۔ اور کئی سال اسی خبط
میں گزار دے۔ اگر اسے کوئی نصیحت کرے کہ یہ تیری محنت ضائع جاتی ہے
تو اس کو چھوڑ کر کسی آباد شہر میں جا کر نانوائی کا کام شروع کرے تو وہ اسے
کہے کہ دنیا پھر آئے گی۔ اور یہ جگہ آباد ہو گی اور لوگ مجھ سے اگر روٹیاں و
دال وغیرہ خریدیں گے۔ تو جس طرح یہ شخص اپنے بیہودہ کام کا کوئی ثمرہ نہیں
پاتا اور اس کی محنت اور عمر رائگاں جاتی ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی اپنے کام
کے بدلے نہ خدا سے نہ لوگوں سے نہ دنیا میں نہ آخرت میں کوئی نفع نہیں پائیگا
اگر کوئی کہے کہ خداوند تعالےٰ نے ہی اس کو اس جگہ رکھا تھا۔ اس واسطے اس
حالت سے نکلنا ممکن نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اللہ پر حجت نہیں
ہے۔ کیونکہ انسان کو عقل و ارادہ دیا گیا ہے۔ وہ دیگر حیوانات کی طرح
محض طبیعت کے پھندے میں نہیں ہے۔ اگر انسان کے اندر قوت و عقل

وارادہ نہ ہوتی تو انبیاء و رسل و کتب الہامیہ و اوامر و نواہی تمام عبث و بیہودہ ٹھہرتے۔ اور انسان و حیوان میں کوئی فرق نہ ہوتا اور تمام ادیان مساوی ہوتے پس یہی مثال مذکور ہے اس شخص کی جو ایسے علوم میں مصروف ہوتا ہے جن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور جنکی وقت کے اعتبار سے حاجت نہیں ہوتی۔ اور جن سے اللہ تعالےٰ کا خوف وعظمت و جلالت و حشمت دل میں متمکن و راسخ نہیں ہوتی۔

جاننا چاہیئے کہ اہل اللہ و اہل الحق ہر ایک قسم کے علوم حساب و ہندسہ ریاضی علم منطق علم طبعی وغیرہ علوم جسمانیہ و دماغیہ و روحانیہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے واسطے یہ تمام علوم معرفت کے ہادی اور خداشناسی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر ایک علم سے خدا کی عظمت اور اس کی علوشان و رفعت کا سبق حاصل کرتے ہیں اور العلم حجاب اکبر کا مقولہ ان کے حق میں راست نہیں آتا۔ زیادہ علم ان کے لئے حجاب ہوتا ہے جو اس کو اس اعتبار و جہت سے حاصل نہیں کرتے کہ جس حیثیت سے کرنا چاہیئے تھا۔ اور چونکہ اہل اللہ ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ زیادہ اور حکم اکثر کے واسطے ہوا کرتا ہے نہ قلیل کے واسطے اس لئے العلم حجاب اکبر کا مقولہ اکثروں کے حق میں صادق آتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو علوم اکثروں کے واسطے باعث حجاب ہیں وہ اہل اللہ کے واسطے وسیلہ رفع نقاب ہیں۔ اہل اللہ کے سوا باقی لوگوں کے علم کا تعلق صرف زبان سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے ذوق و معرفت سے ان کے دل خالی ہوتے ہیں۔ اور ان کے دلوں پر ان علوم کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ مسائل کے یاد کر لینے اور عبادات و معاملات کو حفظ کر لینے اور صرف و نحو و اصول کے الفاظ کو ازبر کرنے اور قصر و مدو اظہار

واخفار وتفخیم وترقیق کے لحاظ رکھنے سے بغیر عمل کے ہرگز نجات نہیں ہو سکتی۔
کیا قبر کے فرشتے یا جہنم کے زبانیہ (قسم ہے فرشتوں کی) اس خیال سے کہ وہ
صرفی مولوی ہے یا نحوی عالم ہے یا اصولی ماہر ہے یا قرآن کا قاری ہے
یا شملہ دار فاضل ہے یا عصا دار خطیب ہے بغیر حساب کے چھوڑ دیں گے
اور صرف الفاظ کی برکت سے ان کی تکریم و تعظیم ہو گی۔ حاشا وکلا ہرگز نہیں
عزت و توقیر و نجات و تکریم صرف تقویٰ و پارسائی اور عمل صالح و معرفت
پر موقوف ہے۔ اور کسی کو اذیت و تکلیف نہ پہنچانا نجات کا کامل ذریعہ
ہے جو شخص اس دنیا میں بباعث تاریکی باطن اس سے انکار کرے وہ آخرت
میں ضرور مشاہدہ کرلے گا۔ کیونکہ مرنے کے بعد ہر ایک کی باطن کی آنکھ کھل
جاتی ہے۔ اور (اِنَّ بَصَرَکَ الْیَومَ حَدِیْدٌ) کا مصداق ظاہر ہو جاتا ہے
اور ایسے شخص کے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ ہے۔ جو ہر جمعہ قرآن ختم کرتا ہے
مگر اس کے مواعظ و مواعید سے متاثر نہیں ہوتا۔ دنیا کے اسباب کے واسطے
لڑتا ہے جھگڑتا ہے۔ اور اس کے واسطے دوسرے کی عزت اتارتا ہے اور
اپنی بے عزتی کرواتا ہے۔ اور ایک کوڑی کے واسطے جان دیتا ہے۔ اور
عبدالدرہم والدنیا بنا ہوا ہے۔ حکایت ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے
خواب میں خداوند تعالےٰ سے دریافت کیا کہ یا الٰہی انسان کس چیز سے تیرا
تقرب حاصل کرتا ہے۔ فرمایا کہ میرے کلام سے پوچھا کہ فہم سے یا بغیر فہم
کے جواب دیا کہ فہم سے بھی اور بغیر فہم کے بھی یعنی جو علماء راسخین ہیں وہ تو فہم
کامل و فکر تام کے ذریعہ سے تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اور جو عارف کامل و
محقق صادق ہیں ان کو آلہ فہم و فکر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ مشاہدہ
ومکاشفہ سے ذات حق کا معاینہ اور تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اور جو شخص فہم

دعلم نہیں رکھتا ہے۔ اس کا تقرب محال ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا تقرب جہالت وعدم فہم سے نہیں ہو سکتا اس تقریر سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکالے کہ ہم علوم ظاہریہ وتحصیل الفاظ اصطلاحیہ وتلاوت قرآن وغیرہ علوم متعلقہ الفاظ سے منع کرتے ہیں ہنہیں بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ضرورت کے بموجب ایسے علوم حاصل کرنے چاہئیں جن کا نفع اس کی ذات کو و دیگر عامہ خلائق کو پہنچے۔ اور اس کے ذریعے سے اس پر دنیا وآخرت میں کوئی وبال ونقصان نہ آوے۔ یاد رہے کہ کسی امام نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ کہ وہ صرف علم سے ہی پاک ہو گیا اور علم سے ہی مغفرت ہو سکتی ہے۔ وجہ یہ کہ محض علوم میں نفسانیت شریک ہوتی ہے جب تک عمل نہ کیا جاوے نفس اخلاق رذیلہ وآداب خبیثہ سے پاک نہیں ہو سکتا۔

سیدی ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جو علم ہوا وہوس نفسانی ووسوسہ شیطانی وخواہشات طبعی سے پاک نہ ہو وہ پھینکنے کے قابل ہے۔ اور خلفاء راشدین وصحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین اگر قرآن کی تفسیر میں حتی الوسع عقل وفہم سے کام لیں اور شارع کی زبان سے باہر نہ جاویں اور پھر بھی تفسیر وتاویل میں خطا ہو جاوے تو ان کی خطا معاف ہو گی۔ اور اگر علم وفہم کی تمام طاقت خرچ نہ کریں اور پورا زور نہ لگاویں تو ان کی تفسیر علم و فہم سے نہ ہو گی۔ فَافْهَمْ وَتَامَّلْ۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ مجتہدین کتاب وسنت سے جو کچھ سمجھتے ہیں وہ ان کے واسطے ہے۔ دوسرے کے لئے ضرور نہیں کہ اس کی تقلید کرے۔ اور تمام جہان پر اس کی تقلید ضروری وواجب نہیں ہے۔ اسی واسطے خود ائمہ نے اپنی تقلید سے لوگوں کو منع کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر شخص کو مرتبہ نظر و

فکر وغور و خوض کا حاصل کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ انسان قابل ترقی کی کوئی حد نہیں ۔ اور ہر شخص مدارج ترقی کے موافق حسب استعداد خویش دوسرے کے کلام سے نتیجہ نکالتا ہے ۔ ایسی ہی مجتہدین نے بھی اپنی استعداد و لیاقت کے موافق کتاب و سنت کو سمجھا ہے ۔ اور ہر شخص اپنی سمجھ و خیال کے پیچھے چلتا ہے ۔ پس ان کی سمجھ ان کے لئے ہے نہ غیروں کے واسطے صحیح ہے ۔ (لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) فتامل وتفکر ۔

دیگر اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ایسے حدیثوں کی جو ظاہر میں ظاہر بینوں کے یہ متعارض و متخالف معلوم ہوتی ہیں ان میں مختلف اعتبارات و وجوہات و حیثیات سے تطبیق دے سکتا ہے ۔ اور حتی الامکان کسی چیز کو شریعت سے خارج نہیں کرتا ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کا یہی طریقہ تھا ۔ اور یہ نہیں کرتا کہ جو بات اس کی سمجھ و فہم میں آجاوے اور وہ تول لے اور جو اس کی عقل سے برتر ہو پھینک دے بلکہ وہ بالاتر از عقل خویش کو تسلیم کرتا ہے ۔ اور اس کے انکشاف کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنے غیر امام کے قول سے نفرت نہیں کرتا ۔ اور ہر ایک امام کو حق پر سمجھتا ہے کیونکہ ہر ایک نے جو کچھ کہا ہے اپنے اجتہاد و لیاقت و استعداد سے کہا ہے ۔ چونکہ حق کا دائرہ وسیع ہے اور ترقی کا دروازہ بند نہیں ہوا ۔ اس واسطے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ترقی میں تھے ۔ اور مجتہدین نے بھی اپنی اپنی ترقی کے موجب سمجھا اسی واسطے مذاہب متعددہ ہو گئے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جانتے تھے کہ مدارج قرب کی ترقی بند نہیں ہوتی تو انہوں نے مجتہدین و متفکرین کو استنباط احکام کے میدان میں عقل و فہم کے گھوڑے دوڑانے کی عام اجازت دے دی اور کسی کو استعداد کامل و اعلیٰ لیاقت کے اعتبار

سے مصیبت (رائے صاحب رکھنے والا مطلب کی تہ تک پہنچنے والا) کا خطاب دیا اور کسی کو ناقص استعداد کی وجہ سے مخطی (خطا کرنیوالا اصل مطلب تک نہ پہنچنے والا) کے نام سے نامزد کیا۔ اور دونوں کو ہر دو حالت میں بلحاظ ان کی کوشش وہمت کے اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرایا۔ کیونکہ جس نے خطا کی ہے۔ عمداً نہیں کی بلکہ ضعف استعداد ولیاقت ناقص کی وجہ سے ہے۔ مگر اس نے بھی کوشش میں حسب استعداد کوتاہی نہیں کی۔ اسی واسطے وہ بھی اپنی محنت کی اجرت کا مستحق ہوا۔ اگر اس کی استعداد پوری ہوتی تو خطا و غلطی کیوں کرتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کتاب وسنت میں اگر کسی کو کوئی مقام متعارض معلوم ہوتا ہو تو ان میں سے ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ نہ ٹھہرائے بلکہ دو اعتبارات سے ان میں تطبیق دے اور ہر دو مضمون کو اپنے اپنے وقت و محل کے مطابق صحیح سمجھے۔ ہاں اگر کہیں صراحۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کوئی بات منسوخ معلوم ہوتی ہو تو اس کے منسوخ ماننے میں کوئی ہرج و خلل نہیں ہے احادیث میں جو ظاہر بینوں و کم فہموں کو تعارض و مخالف نظر آتا ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں بلکہ سائلین و مخاطبین کی مختلف استعداد کی وجہ سے مختلف و متعدد جواب ہیں کیونکہ جو شخص ترقی کے تمام مدارج طے کئے ہوتا ہے وہ ہر شخص کے درجہ کو سمجھ کر اسے فائدہ پہنچانے کے لئے اس کی استعداد و درجہ ترقی کے موافق اس کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کلام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر سکتے تھے وہ ایک گنوار عرب کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی واسطے آپ کا مقولہ تھا (اُمِرْتُ اَنْ اُخَاطِبَ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ) اسی اعتبار سے آپؐ نے ایک لونڈی سے پوچھا اَیْنَ اللّٰہ اللہ کہاں ہے۔ اس نے کہا آسمان میں آپؐ نے فرمایا کہ بخدا یہ مومنہ ہے۔

اگر یہی سوال کسی اکابر صحابی سے کرتے تو مکانیت کا سوال نہ کرتے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ وہ صحابی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی خاص مکان میں ہونا محال ہے۔ اس واسطے اس سے خصوصیت مکان کا سوال کرنا بے محل و بے موقع ہوتا۔

جاننا چاہیئے کہ وہ الفاظ عربیہ جن سے ذات باری تعالیٰ کا مکان مخصوص میں ہونا پایا جاتا ہے۔ وہ ایسے مقام مخاطبین کے اعتبار سے ہیں جن کا تصور اس درجہ سے زیادہ پرواز نہیں کر سکتا۔ ورنہ عقلی دلیل اس کے منافی ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ایسے الفاظ صادر ہوں جن سے مکانیت کا شبہ پڑتا ہو۔ تو پس اپنے تصور ذہنی کے نہیں سمجھ سکتا۔ پس اگر ایسے وقت میں اس سے اس درجہ کی کلام کی جاوے جس کو جو کا وہ ابھی آشنا نہیں ہوا۔ تو اس کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اور حکمت کے شان کے برخلاف ہوگا۔ پس حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے مخاطبوں سے اسی درجہ کے کلام کرے جس کو وہ سمجھ سکیں اور اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی واسطے آپ نے اس لونڈی سے ایسا ہی سوال کیا اور جب اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا تو آپ نے اس کے حق میں مومنہ کہا یعنی تقلیداً ماننے والی و تصدیق کرنے والی اور عالمہ نہیں کہا۔ فافہم۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وآلہ وسلم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے۔ دیکھا کہ پست آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں آپ نے پوچھا کہ اونچی آواز سے کیوں نہیں پڑھتے کہا کہ میں صرف اپنے رب کو سناتا ہوں۔ فرمایا کہ کچھ اونچے پڑھو۔ پھر عمرؓ کے پاس گئے۔ دیکھا کہ بلند آواز سے پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا کہ پست آواز سے کیوں نہیں پڑھتے۔ جواب

دیا کہ سوتوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ فرمایا کچھ آہستہ کرو دیکھو کہ کس حکمت و دانائی سے دونوں کو دو مختلف کاموں سے ایک ہی نتیجہ پر لائے ہیں۔ اور ہر دو کو متضاد امور سے یکساں فائدہ پہنچایا ہے۔ غور کرنے والے کو اس قسم کی بہت سی باتیں احادیث میں مل سکتی ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جس نے اہل اللہ کے مذاق سے کچھ حصہ نہیں لیا وہ شریعت کے اسرار کو نہیں سمجھ سکتا اور جس کے اندر ذکر و فکر کا نور نہیں ہے۔ وہ قرآن کے نور سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ سچ ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ یعنی جس کے باطن میں نور نہیں ہے۔ وہ اور نور سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ علوم ضروریہ کو حاصل کرتا ہے جن کی معرفت و تحصیل ضروری ولابد ہے اور جو سوال کئے جانے کے قابل ہیں۔ اور جن پر وہ عمل کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ چند روزہ عمر غیر ضروری اشغال کے لئے مکتفی نہیں۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ نے کشف سے بتلایا تھا کہ نوسو بتیس ۹۳۲ ہجری کے آغاز سے علوم کا دلوں میں قائم ہونا رفع ہو گیا۔ اس کے بعد دل اس کو پھینکتے ہیں۔ اور ایسے دل نہیں رہے جن میں علوم قائم ہو سکیں اور اس وقت سے دل دنیاوی بلاؤں میں مبتلا رہیں اور اس کے بعد علم الٰہی کی ترقی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اب جو کوئی اس علم میں گفتگو کرتا ہے۔ تو وہ وہی علوم ہوتے ہیں۔ جو اس سال سے پہلے حاصل ہو چکے ہیں۔ جب یہ بات معلوم ہو چکی تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گوشہ یا مدرسہ میں بیٹھ کر خرید و فروخت و رہن و تمسک و دعویٰ و شہادت و صرف و نحو وغیرہ علوم الفاظیہ میں ساری عمر تلف کرنے سے کیا حاصل اور دل کی صفائی سے غافل ہونا کیسی خجلت و ندامت کا سامنا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے عمل دیکھ رہے ہیں۔ یاد رہے کہ قرارت ونغمہ وحسن صورت سے قرآن پڑھنا کامل اولیاء کو جو انبیاء کے حقیقی وارث ہیں بچھبتا ہے۔ کیونکہ وہ ان امور سے حضوری قلب سے باہر نہیں ہو سکتے اور یہ امور ان کو اللہ کی حضوری اور ملاقات ومناجات سے (جو تلاوت قرآن سے مقصود بالذات ہے) خارج نہیں کر سکتے۔ لیکن دوسرے لوگ جو درجہ ولایت تک نہیں پہنچے ہوتے۔ ان کے واسطے نغمہ وحسن صوت سے تلاوت قرآن مجید کرنا ان کو حضوری بارگاہ الٰہی ومناجات قلبی سے مانع ہے۔ کیونکہ ان کے قلوب یکسو نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہوتے ہیں پس ایسی صورت میں تلاوت قرآن مجید سے جو مقصود بالذات ہے وہ فوت ہو جاتا ہے۔ خصوصاً مساجد کے امام اس مرض میں بہت مبتلاء ہیں اور نغمہ ومد وشد سے قرآن مجید پڑھتے ہوئے انہیں غلطی واعراب میں خطا ہو جانے وبے موقع وقف ہو جانے وغیرہ خیالات کا خوف لگا رہتا ہے۔ اس واسطے وہ خداوند کریم کی درگاہ میں حاضر نہیں ہو سکتے۔ اور حضور قلب جو نماز کی روح ہے۔ ان میں پایا نہیں جاتا۔ حالانکہ نماز مناجات کا محل ہے جس میں غیر حق کی طرف متوجہ ہونے کی گنجائش نہیں۔ اور نماز کی علت غائی یہ ہے کہ اپنے حقوق آداب وروح سے ادا کیے جاویں۔ نہ کہ محض ارکان مخصوصہ کی صورت وہیئت سے۔ اصلی غرض تو یہ تھی کہ ہم ہمیشہ اللہ تعالٰے کی طرف متوجہ رہیں۔ جیسا کہ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ)[1] سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالٰے نے تخفیف کر دی اور

---

[1] جن وانسان کی پیدائش سے مقصود بالذات عبادت وتوجہ الی اللہ ہی ہے۔

صرف نماز میں ہی توجہ کو فرض رکھا پس اگر اب بھی ہم نماز میں اس سے غافل رہیں اور غیر حق سے روگردانی کر کے توجہ تام سے اس کی درگاہ میں حاضر نہ ہوں تو پھر ہم صرف برائے نام نمازی ہوں گے نہ اصلی۔ دل جب کہ ہمیشہ اشرف و اعلےٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خدا سے بڑھ کر کیا چیز ہے کہ جس کی طرف دل کو متوجہ کیا جاوے۔ اس لئے اہل اللہ کا قول ہے۔ کہ عارف کے نزدیک ہر ایک بلا بہ نسبت دو رکعت نماز کے اس کی ہیئت پر ادا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ جب میں نے اس حالت کا مزہ چکھا تو میری یہ حالت تھی کہ میں قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا نہ نماز میں نہ کسی اور مقام میں۔ اور جب میری زبان سے نماز کے بغیر کوئی کلام بغیر ارادہ بھی نکل جاتی تھی۔ تو میں استغفار پڑھتا تھا۔ اور ایسی حالت طاری ہوتی تھی کہ جس کو صاحب ذوق ہی سمجھ سکتا ہے۔ جو الفاظ و عبارت سے ادا نہیں ہو سکتی۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت سے یہ حجاب دور کر دیا والحمد للہ علی ذالک۔

امام غزالیؒ کا قول ہے۔ کہ نماز میں غفلت کرنے والا اس کا تارک ہے پس جس طرح افعال ظاہرہ و ارکان مخصوصہ۔ ظاہرہ کا ترک کرنے والا شریعت کی تلوار سے قتل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص افعال باطنہ و حضور قلب کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس کو خدا تعالےٰ قیامت کے دن قتل کرے گا کیونکہ عبادات بغیر صریح مشاہدہ و واضح معاینہ کے درست نہیں ہو سکتی۔ یہی اہل اللہ و اہل حق کا مذہب ہے۔ فافہم اور اللہ تجھے ہدایت کر دے گا۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ جس قدر علم حاصل کرتا ہے اس میں خدا کے ساتھ یہ معاہدہ نہیں کرتا کہ اس پر ضرور عمل کرے گا۔ کیونکہ وہ اس وعدہ کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ کیونکہ انسان کا ارادہ اللہ کے ارادہ

کے تابع ہے۔ تو جس چیز کو خدا نہ کرنا چاہے گا اس کو بندہ کیونکر کر سکے گا۔
اس واسطے اسے لائق نہیں ہوتا کہ خدا تعالےٰ کے ساتھ ایسا معاہدہ کرے
جو اس کی قدرت وطاقت سے باہر ہو۔ بلکہ وہ علم کو امتثال امر (حکم بجالانا)
کے واسطے سیکھتا ہے۔ اور جس قدر عمل اس کی قسمت میں ہے۔ وہ ضرور ہو ہی
جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ بہ نسبت بندہ اس کی بہتری کو خوب جانتا ہے
پس جو شخص یہ نکتہ سمجھ لیتا ہے۔ وہ اپنے ارادہ کو اللہ تعالےٰ کے ارادے
میں فنا کر دیتا ہے۔ کیونکہ خلقت کی سعادت کی مدار اللہ تعالےٰ کے عفو
پر ہے نہ علم وعمل پر۔ پس جس شخص سے اللہ تعالیٰ مسامحت اور معافی دی وہ
ناجی ہے۔ اور جس سے مناقشہ ہوا اور حساب طلب ہوا۔ وہ ہلاک ہو گیا
اگرچہ اس کے پاس ہر دو ثقلین (جن وانس) کے اعمال بھی ہوں جو شخص آیت
(وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ) میں غور کرتا ہے وہ سمجھ سکتا ہے۔ کہ کثرت
عبادت پر نجات کا دارمدار نہیں ہے۔ اور اہل اللہ اس کو خوب سمجھتے ہیں
ہاں یہ بات ضرور ہے کہ انسان کو عدم امتثال (حکم نہ ماننا) وعدم اجتناب
نواہی (منع کئے ہوئے کاموں سے پرہیز نہ کرنا) سے عذاب دیا سکتا ہے
کیونکہ وہ صاحب ارادہ ہے۔ اختیار وتدبیر اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور
مخالفت احکام الٰہی کی صورت میں اس کا تحکم (حکم چلانا) خدا پر لازم آتا
ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ یا اتباع شریعت اس وجہ سے
واجب ہے کہ انسان امور آیندہ کے اندازہ سے جاہل ہے۔ اسی واسطے
اس کو بے وجہ اپنے سے اعلیٰ کا حکم ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی بہتری
اسی میں ہے۔ یا منہیات سے باز رہنا اس کے واسطے قرب الٰہی کا باعث
ہے۔ اور عمل پر نجات کی مدار نہ ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ اکثر لوگوں کے

حق میں ان کے اعمال عجب و تکبر کا باعث ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان لوگوں
پر جو ان جیسا کام نہیں کرتے تکبر و غرور کرتے ہیں اور ان کو نظر حقارت
سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ اپنے جیسے کام کرنے والے پر بھی تکبر و عجب کرتے ہیں اس
ظن و خیال سے کہ ہمارا عمل اخلاص سے ہے اور دوسروں کا ریا و نفاق سے
جیسا کہ اکثر مشاہدہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ عبادت سے مراد یہ ہے کہ لوگوں
کا اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع ہو۔ خواہ طاعت سے یا معصیت سے
کیونکہ کبھی طاعت باعث مقت و عذاب ہو جاتی ہے۔ اور معصیت
موجب فروتنی و انکسار ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی طاعت و عبادت
کرنے والا اپنی عبادت سے اترائے اور غرور و تکبر کرے تو وہ
مطرود (راندہ) و ملعون ہو جاتا ہے۔ اور اگر گنہگار اپنے گناہ پر نادم
ہو اور ڈرے اور روئے اور خداوند کریم کے سامنے عاجزی اور فروتنی
کرے تو وہ مقرب اور اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ
عبادت جب خالص نہ ہو تو وہ اپنے صاحب کے لئے باعث عذاب
ہوتی ہے۔ اور قساوت قلب (دل کی تاریکی و سختی) کا ذریعہ ہوتی
ہے۔ میرے سردار شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ رحمۃ اللہ تعالےٰ فرمایا
کرتے کہ جس گناہ سے انکسار فروتنی پیدا ہو وہ اس عبادت سے اچھا
ہے جس سے تکبر و غرور پیدا ہو۔ جب یہ معلوم ہو چکا تو ادب یہی ہے
کہ اوامر کے بجا لانے اور نواہی کے چھوڑ دینے میں خدا تعالیٰ کے ساتھ
معاہدہ و مواعدہ نہ کرے اور ہر ایک امر اس کے حوالہ کر دے ہاں
اتنی بات ضرور ہے کہ جو امر کے مخالف نظر آوے اس سے توبہ کرے
اور جو اس کے موافق ہو شکریہ بجا لاوے اور اگر ضروری معاہدہ کرنا چاہے

تو اللہ تعالےٰ کی مشیت وارادے مقید کردے اور کہے اگر خداوند کریم نے چاہا تو میں ضرور ایسا کروں گا۔ جیسا کہ مومن کہتا ہے (اَنَا مُؤمِنٌ اِنْشَاءَ اللّٰہُ تعالیٰ) میں مومن ہوں اگر خدا چاہے اور اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کو اپنے ایمان میں شک ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تبرکاً وتحویل وتبدیل کے خوف سے ہوتا ہے کیونکہ (اِنَّ اللّٰہَ یَحُولُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ) بھی وارد ہے۔ فافہم

یہ بھی یاد رہے کہ اوامر کے جاننے سے یہ لازم نہیں کہ تعمیل بھی کی جائے اور نواہی کے علم سے یہ ضرور نہیں کہ ان سے اجتناب وپرہیز بھی کیا جائے کیونکہ اللہ تعالےٰ جو کچھ انسان سے کرانا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اس کی مخالفت نہیں ہوسکتی اور اس کا ارادہ ہی غالب رہتا ہے۔ پس ہر حال میں بندہ کے واسطے بہ نسبت معاہدہ کے ادب وتسلیم ہی بہتر ہے۔ پس اس نکتہ کو سمجھنا چاہیے اور اس میں مجادلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسے دعوے کرنے والے کی حالت خود ہی اس کو جھٹلاتی ہے۔ کیونکہ وہ بہت سے امور کی فضیلت کا قائل ہوتا ہے۔ اور کرتا کچھ نہیں۔ مثلاً صلوٰۃ کسوف اور صدقات کی فضیلت میں بحث کرتا ہے۔ اور کچھ نہیں کرتا۔ اور خرید وفروخت بیع سلم ورہن وغیرہ معاملات میں حرام وحلال کی تقریریں کرتا ہے اور ان کے موافق عمل نہیں کرتا پس اس تقریر سے یہ نکتہ بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی عبادت وتقرب کے وسائل وذرائع اختیار کرنے میں کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے جس طرح سے کوئی تقرب چاہتا ہے اور اس کو تقرب کا ذریعہ سمجھتا ہے تو اس کے لئے وہی کافی ہے۔ مثلاً ذکر کرنے والے کو قرآن کی تلاوت کرنے والے پر اعتراض کا حق نہیں ہے ایسا ہی تلاوت کرنے والے کا حق نہیں ہے کہ وہ ذکر کرنے والے یا تہجد پڑھنے والے یا کسی اور طریق سے عبادت کرنے والے

پر جرح کرے۔ کیونکہ خداتعالےٰ کے تقرب و توصل کے راستے بموجب (اَلطُّرُقُ[1] اِلَی اللّٰہِ بِعَدَدِ اَنفَاسِ الخَلَائِقِ) کے بیشمار و لا انتہا ہیں اور معترض جس راستہ کو اس کے تقرب کا طریق نہیں سمجھتا وہ اس کے لئے ہے نہ غیر کے لئے پس ہے (وَلِکُلٍّ[2] جَعَلنَا شِرعَۃً وَّمِنھَاجًا) (وَکُلٌّ[3] مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ) یہ بات میں نے اس واسطے ذکر کی ہے تاکہ طالب علم جو کہ علم کا دعوےٰ کرتے ہیں وہ ذاکرین و فقرا پر اعتراض نہ کریں۔ کیونکہ اس قسم کے عالم کہا کرتے ہیں کہ علم میں مشغول ہونا افضل ہے۔ حالانکہ نہیں جانتے کہ علم سے کیا مراد ہے۔ اور ان کے عمل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ لیلۃ القدر کو بھی صبح تک سوئے رہتے ہیں۔ اور زبان سے لا الٰہ الّا اللّٰہ و اللّٰھمّ اغفر لی بھی نہیں نکالتے۔ اور اس سے زیادہ کیا غرور ہوسکتا ہے۔ اور نہیں جانتے کہ اللہ تعالےٰ کا تقرب عمل نالص سے ہی ہوتا ہے۔ اور ان کو کیا معلوم ہے کہ فقرا معرفت کے دریا میں تیرتے ہیں اور شب و روز اس سے پانی پیتے ہیں اور لوگوں کو پلاتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ اس قسم کے عالموں سے ایک کو لیلۃ القدر کی رات ذکر کے واسطے بیدار کیا اور وہ جمعہ کی رات تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور پھر سو گیا اور کہا کہ عالم کی نیند جاہل کی عبادت سے اچھی ہے۔ کاش کہ وہ خاموش رہتا اور اپنی لیاقت و فہم کو ظاہر نہ کرتا اور جانتا کہ جس علم سے ہدایت کا راستہ نہ کھلے وہ جہالت اور ضلالت ہے اور جس علم سے ترک

---

[1] اللہ کے قرب کے راستے مخلوقات کے سانسوں کے شمار کے برابر بے نہایت ہیں۔

[2] ہم نے ہر ایک کے لئے ایک راستہ و طریقہ بنا دیا ہے۔

[3] ہر ایک کے لئے وہی آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

دنیا و اخلاق ذمیمہ و رغبت آخرت و عادات حمیدہ حاصل نہ ہو وہ باعث حسد و تکبر و موجب ریا و شہرت ہے اور ایسے شخص کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنے سوا سب کو برا خیال کرتا ہے اور ساری خلقت کو گمراہ و ہالک اور خود کو ہی ناجی (نجات پانیوالا) خیال کرتا ہے - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسی قسم کے عالم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ آیا ایک گروہ کا قرآن کو صبح تک جہر سے پڑھنا حلال ہے یا حرام - مولوی صاحب نے جواب دیا کہ یہ تو نص قرآن سے حرام ہے کیونکہ اللہ تعالٰے نے رات کو سَکَناً (باعث راحت و آرام ہے) بنایا ہے - اور اس کی مخالفت کرتا ہے - ایک اور شخص نے فتوٰے پوچھا کہ کیا جمعہ کی رات اللہ کا ذکر کرنا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود سلام پڑھنا ایک حلقہ بندی و جماعت بندی کی شکل میں جائز ہے یا نہیں - مولوی صاحب نے ارشاد کیا کہ یہ بطالون (جھولٹوں) بے مروتوں کا کام ہے - اور یہ بدعت ہے اور اللہ تعالٰے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر انسان کے لئے ساری عمر میں ایک دفعہ کافی ہے - اہل دل خیال کر سکتا ہے کہ اس جواب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی بے ادبی ہے - اور اللہ تعالٰے کے ذکر کو بدعت ٹھہرانا کیا ظلم و جفا ہے - مگر بات یہ ہے کہ مولانا مقدس کو معلوم نہیں تھا کہ بدعت کیا چیز ہے - اور اس کی کیا علامتیں ہیں وہ نہیں جانتے تھے کہ ہر ایک نیا طریقہ و جدید قاعدہ جو اللہ تعالٰے کے تقرب و توصل کا موجب ہو وہ شریعت حقہ و سنت صحیحہ ہی ہے - حدیث سے اس قسم کے اختراع و ابتداع کی صاف اجازت معلوم ہوتی ہے - جیسا کہ (مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً) جو شخص کوئی نیک طریقہ نکالے وہ نکال سکتا ہے - اس سے پتہ جاتا ہے کہ استنباط [illegible] طریقہ و مفید قاعدے

کے ابتداع و جاری کرنے کی اجازت ہے ۔ اور اس میں ابتداع کرنے والے
اور عمل کرنے والے کے لئے اجر و ثواب ہے اور اس سے یہ بھی پایا جاتا ہے
کہ جو عالم اپنی ہمت کے موافق کوئی ایسا طریقہ نکالتا ہے جو جزئی و فرعی
طور پر مقررہ شریعت کے جزئیات کے موافق نہیں ہوتا تو وہ شخص ایسی صورت
میں کھڑا کیا جائے گا کہ اس کا کوئی امام نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ خود ہی امت
واحدہ (مستقل امام) ہو جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام زمانہ فترت میں
اُمَّۃً وَّاحِدَۃً تھے یعنی اس وقت میں خود ہی امام تھے کسی کے مقتدی نہ تھے۔ اور
پھر جب وحی کے نزول کا زمانہ آیا تو پھر رسول صاحب شریعت ہو گئے۔
وجہ اس ابتداع کی اجازت و خیریت کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت سے مقصود بالذات مکارم اخلاق کا درجہ اتمام پر پہنچانا ہے جیسا
کہ (بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ) سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور مقصود بالذات
کے حصول کے ذرائع بے شمار ہوا کرتے ہیں۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص مکارم
اخلاق کی تکمیل و اتمام کے واسطے کسی زمانہ میں ضرورت کے موافق کوئی نیا طریقہ
ایجاد کرتا ہے وہ خدا کی طرف سے ایک شریعت پر ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کو یہ بات
معلوم نہ ہو۔ حکیم بن حزام کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نیک کام ہر حالت
و ہر صورت میں نیک ہی ہے اگرچہ وہ کسی خاص جزئی کے مطابق نہ بھی ہو۔ حدیث
کا مضمون یہ ہے کہ حکیم بن حزام نے جاہلیت میں صدقہ و خیرات و بردہ آزادت
وصلہ رحم و بخشش وغیرہ نیک کام بہت کیا کرتا تھا۔ جب وہ اسلام میں داخل
ہوا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اعمال کی نسبت سوال کیا۔ آپ نے

لہ یعنی مکارم اخلاق کی تکمیل کے واسطے مبعوث ہوا ہوں۔

فرمایا کہ تو نیکیوں کے ساتھ ہی اسلام لایا ہے۔ اور اس کا قصہ ترجمہ کا تما
تقریر سے معلوم ہوا کہ جو شخص شریعت کے مطالب و مقاصد اور اس کے دقائق
و معارف و اسرار و منافع کو نہیں سمجھتا ہے اس کو شریعت سے کچھ بھی حصہ نہیں۔
اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو مفتی بغیر اصول شرعی جاننے کے اس امر کا فتویٰ
دیتا ہے کہ خاص شکل و ہیئت سے حلقہ بندی کر کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا بدعت
ہے۔ وہ جاہل غبی مطرود و ملعون ہے۔ اور اس کے حال سے معلوم ہوتا ہے کہ
وہ نہیں صحبت کے لائق ہے۔ کیونکہ اگر وہ اہل تقرب سے ہوتا تو ہرگز ایسے
کلام اس کے منہ سے نہ نکلتے۔ بھلا بندہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کیونکر صبر
کر سکتا ہے۔ حالانکہ وہ روح و دل کی زندگی ہے۔ جیسے پانی مچھلی کے لئے۔ بخاری
وغیرہ احادیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی
مثال زندہ و مردہ کی ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ میں ذکر کرنے والے کا جلیس
(ہم صحبت و ہم جلسہ) ہوں اور جب تک میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس
کے ساتھ ہوں۔ پس غور کرنا چاہیئے کہ بے مروت و بے ہمت کیونکر خدا تعالیٰ کا
ہم جلیس ہو سکتا ہے۔ بلکہ اہل اللہ تو نہایت عالی ہمت ہوتے ہیں اور ان کی
ادنیٰ ہمت یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اور اس کے مراقبہ و مشاہدہ
میں مصروف رہیں اور اللہ تعالیٰ کی موانست و موافقت سے مسرور رہیں۔ کسی کو
کیا معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جلیسوں کو کیا علوم حقہ و معارف دقیقہ و
آداب پسندیدہ و اخلاق حمیدہ عطا کرتا ہے۔ پس انسان کو فقراء ذاکرین کا
ادب کرنا چاہیئے اور وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ادب کرتا ہے۔ یہ بات یاد
رکھو اور غافل نہ ہو کہ اس کا وبال دنیا و آخرت میں تجھی پر عائد ہوگا۔ اور یہ حال
اولیاء اللہ کے منکرین کی حالت سے مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی

کا قول ہے۔ کہ منکرین ولایت کا خاتمہ برا ہوتا ہے۔ حالانکہ اہل اللہ مجتہدین کی طرح صاحب شریعت نہیں ہوتا۔ تاہم ان کے انکار میں منکروں کے لئے ان کی ذلت و رسوائی ہے۔ اولیاء کا کام صرف اسرار شریعت و معارف حقیقت و حقائق معرفت بیان کرنا ہوتا ہے۔ ان نکات کو وہی سمجھتا ہے جو ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور فہم کا مادہ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے اور ان کے معتقدین سے راضی ہو۔

دیگر اس کی علامت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کے دل کی آنکھیں کھول دیتا ہے اور اسرار شریعت سمجھنے لگتا ہے تو وہ کسی امام مذہب کے احکام کو بے دلیل نہیں مانتا اور اس کے فتوے کو تمام مخلوق کے لئے یکساں نہیں سمجھتا بلکہ ہر ایک سائل کو اس کے حال کے موافق جواب دیتا ہے۔ اور کسی منقول مسئلہ کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ اس کو اصول کی ایک مثال و نظیر خیال کرتا ہے۔ اگر کوئی سائل خاص منقول سے ہی جواب لینا چاہے تو اس کو ایسا ہی منقول سے فتویٰ دیتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں سائل کے حق میں یہی امر مفید ہے اور اثبات حق اسی طرح مطلوب ہے میں نے امام شافعیؒ کے اصحاب (کے شاگردوں) کے اکثر کلاموں و منقولوں کے قواعد و اصول کو جامع و مانع نہیں پایا۔ ہاں خود امام مذکور کا کلام جامع و مانع ہے۔ اور ان کے کلام کا کوئی قاعدہ داخل جامعیت و مانعیت سے خارج نہیں۔ مثلاً ان کے اصحاب کے مسائل میں سے ایک یہ مسئلہ ہے۔ کہ اگر روزہ دار کے سر میں کوئی جراحت یا شکم میں کوئی ضرب پہنچے تو افطار کر ڈالے اگرچہ اس میں روزہ کا دروازہ بند کرنا ہے۔ تاہم روزے کی بے حرمتی نہیں ہے کیونکہ یہ کھانا عرف و شرع میں اکل (کھانا) نہیں کہلاتا۔ اسی واسطے ہم نے

کہا ہے کہ عبد کی علامت یہ ہے کہ وہ بیدار ہوشیار ذہین ذکی ہو اور جو مسئلہ
شرعی اس سے دریافت کیا جاوے اس کی علت غائی و منشا کلام و موقع
ومحل وضرورت ووقت کا لحاظ رکھے اور شریعت کے اسرار اور اس کے
مقصود بالذات میں غور کرے۔ مثلاً اگر کوئی صاحب نصاب زکوٰۃ جس پر
سال گزرنے والا ہو اور وہ حیلہ کی نیت سے مسئلہ منقولی کا سائل ہو جس سے
وہ اسے دوسرے کی ملک کرکے اس کے وجوب سے نکلنا چاہے اور زکوٰۃ
نہ دینا چاہے تو اس وقت چاہیئے کہ منقول سے فتوےٰ نہ دے بلکہ چپ رہے
اور اگر ہو سکے تو اس کے اثبات میں کوشش کرے نہ اس کے ٹالنے میں کیونکہ
اگر وہ منقول سے فتوےٰ دیگا اور حیلہ کو جائز رکھے گا۔ تو زکوٰۃ کا دروازہ
بند ہو جائے گا اور غریب مستحقوں کا حق مارا جائے گا اور یہ سمجھے کہ اللہ تعالےٰ
کے ساتھ فریب کرنا مناسب نہیں اور اس سے اللہ تعالےٰ کا غضب و
قہر نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی پھٹکار ہوتی ہے۔ اگر حیلہ و فریب
جائز ہو۔ تو ان آیات واحادیث کی کیا ضرورت تھی۔ جن میں زکوٰۃ کے دینے
کا حکم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول (صَدَقَۃٌ تُوْخَذُ مِنْ
اَغْنِیَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِهِمْ) کی کیا ضرورت تھی۔ ایسے ہی اسے لائق
ہے کہ مہروں وغیرہ کی مدیئت کے حیلوں میں منقول سے فتوےٰ نہ دے کیونکہ
اس سے مرد عورت کو دکھ دے گا اور اس پر دوسری شادی کرلے گا اور
تمام کام عورت کے مطلب کے مخالف کرے گا اور کوئی انسان بالطبع خصوصاً
عورتیں ہمیشہ ایسی تکالیف کی متحمل نہیں ہو سکتیں اور اس حالت میں وہ اپنے
آپ کو اسیر (قیدی) خیال کریگی اور پھر چھڑکر بھی بلکہ کچھ زیادہ دیکر بھی اپنا
پیچھا چھڑانا چاہے گی اور مرد کے واسطے وہ حلال نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ عورت کی

دیا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ
عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا یعنی اگر عورتیں اپنی طیب خاطر سے مہر
میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں تو تمہیں اس کا کھانا درست و بجا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جو امور ثواب و عذاب سے تعلق رکھتے ہیں اور
جنکا پورا حال مکاشفہ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے ان میں حکماً حکم نہیں لگاتا ہاں کامل عارف حکم
لگا سکتا ہے کیونکہ ان کی قوت علمیہ و عملیہ بڑھی ہوئی ہے۔ اور اللہ
تعالےٰ بھی ان کو ان کے وعدے میں ذلیل و رسوا نہیں کرتا جیسا کہ حکایت
ہے کہ کسی بزرگ نے کسی سے کہا کہ اگر تو راستہ بنا دیوے تو تیرے لئے
محل کا ضامن میں ہوں۔ پس خدا کی طرف سے اس بزرگ کی طرف ایک
کاغذ آیا جس میں لکھا تھا کہ ہم نے تیری ضمانت کو پورا کر دیا ہے۔ جب یہ
معلوم ہو چکا تو ادب یہی ہے کہ ثواب و عذاب کے کاموں میں کچھ جواب
نہ دے کیونکہ یہ جہالت ہے اور خدا تعالےٰ کو اس کے ارادہ سے روکنا
ہے۔ کیونکہ کبھی اس طاعت پر جس میں حصول ثواب کا فتویٰ دیا گیا تھا ثواب
حاصل نہیں ہوتا اور گاہے اس معصیت پر جس میں وقوع عذاب کا فتویٰ
دیا گیا تھا۔ عذاب نہیں ہوتا۔ بلکہ علماء کا کام صرف اوامر و نواہی کا بیان
کرنا ہے۔ اور ثواب و عذاب کا اختیار خدا تعالےٰ کے حوالے چھوڑ دینا چاہیئے۔
ہاں اگر کسی خاص فعل سے حصولِ ثواب و وقوع عذاب کا ذکر کسی صحیح حدیث
میں آچکا ہو تو طالب ثواب کے واسطے اس کا ذکر کرنا کچھ برا نہیں۔ کیونکہ یہ تو
تابعداری ہے۔ اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ پر کوئی حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس کے
حکم کا سنانا ہے۔ یاد رہے کہ جو شخص امور دینیہ میں ذکی ہوتا ہے۔ اس پر اس
قسم کے امور پوشیدہ نہیں ہوتے اور میں نے بھی زیادہ واقفیت کے واسطے

ذکر کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالے ہدایت کا والی ہے۔ اور نیکو کاروں کو ہدایت عطا کرتا ہے۔

تیسرا باب

سلف کے فقراء و مشائخ صلحاء کے حالات میں

میں اس باب میں ذرا تشریح و تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں کیونکہ اس زمانہ میں ایسے مدعیوں کی کثرت ہے۔ جو ہر ایک شئے کے موجد اور ہر خیر کے خاتم (ختم کرنے والے) ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ اگر کسی کو اس کے شیخ نے ذکر کے تلقین کی اجازت دیدی ہے۔ یا اجازت سے پہلے ہی اس کا شیخ فوت ہو گیا اور اس نے خلوت میں ہاتف (فرشتہ یا جن) کو اذن دیتے سن لیا۔ تو وہ اپنے آپ کو ولی خیال کرتا ہے۔ اور عوام کے ہجوم سے یہ خیال ان کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے۔ پس خود گمراہ ہوتے ہیں اور اوروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ولایت کا درجہ ایک بڑا مرتبہ ہے۔ یہاں تک کہ جو اس درجہ کو پہنچ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا دوست ہو جاتا ہے۔ تو تمام آسمان و زمین کے رہنے والے و تمام حیوانات و نباتات اس کی ولایت کو پہچانتے ہیں اور تمام خلقت اس سے محبت رکھتی ہے۔ ایک عارف کی حکایت ہے۔ وہ ذکر کرتے ہیں کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کوہ قاف پر گیا۔

ہم ایک اژدہا کے پاس سے گزرے جو دریا کو احاطہ کئے ہوئے تھا۔ ہم نے اُسے سلام دیا اُس نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کہ ابو مدین شعیب اور اس کے عیال و اطفال کا کیا حال ہے۔ اور وہ اس وقت مغرب کی زمین میں رہتے تھے۔ ہم نے کہا کہ ہم اس کو خیر و عافیت سے چھوڑ آئے ہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں ان کا نام کیونکر معلوم ہوا۔ وہ متعجب ہوا اور کہا کوئی روئے زمین پر ایسا ہے جو انہیں جانتا ہو وہ تو اللہ تعالیٰ کا ولی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس کی محبت کو تمام مخلوقات کے دل میں ڈالا ہوا ہے۔ یہ ہے مرتبہ ولایت کا۔ بھلا جس شخص کی ولایت کو اس کی سواری کا گدھا بھی نہ جانتا ہو وہ ولی کیونکر ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک کتاب تصنیف کی تھی اس میں اولیاء کے منازل و مدارج اور ان کے علوم کا ذکر ہے۔ وہ شمار میں دو لاکھ اٹھائیس ہزار ہیں۔ پھر ہر ایک منزل کے قرآن کی سورتوں کے مطابق ایک سو چودہ مراتب ہیں۔ ہر منزل میں چند علوم ذکر کئے ہیں۔ اس خوف سے کہ اس زمانہ کے فقرا اپنی بے علمی سے وجود منازل اور ان کے علوم سے انکار کریں گے کیونکہ انسان کا قاعدہ ہے کہ جو بات اس کی فہم و علم سے باہر ہوتی ہے۔ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ سچ ہے (بَلْ[1] كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ۔ [2]وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ) میں امید کرتا ہوں کہ جو شخص اس کتاب کا مطالعہ کرے گا وہ یقیناً سمجھ لے گا کہ ابھی اس نے ولایت کے راستے کی بو بھی نہیں سونگھی چہ جائیکہ حاصل کیا ہو۔

---

[1] جب اس کی اصل حقیقت نہیں سمجھتے اور اس کی ماہیت پر احاطہ نہیں کرتے تو جھٹلا دیتے ہیں۔

[2] جب اس کو نہیں سمجھے تو جلدی کہدیں گے کہ یہ تو قدیمی جھوٹ و افترا ہے۔

کیونکہ وہ تو علوم کے اسرار سے بھی عاری و ناواقف ہوگا۔ چہ جائیکہ
علوم کی حقیقت سے واقف ہو۔ کیونکہ علوم کا تعلق دل سے ہے نہ زبان
سے۔ علوم زبان سے ادا نہیں ہو سکتے۔ اسی واسطے اس گروہ کے سردار حضرت
ابوالقاسم جنیدؒ کا قول ہے۔ کہ اُس وقت تک مرد کامل نہیں ہوتا جب تک
کہ ہزار رسمی عالم اس پر ملحد و زندیق ہونے کا فتویٰ نہ لگالیں۔ کیونکہ کاملوں
کا درجہ نقل و عقل کی حد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ان کی کشف و
کرامات کی راہ کھلی ہوتی ہے۔ اور رسمی عالم اس کو نقل و عقل سے ثابت
کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس آلہ کا گھوڑا اس میدان میں لنگڑا ہوتا ہے اور
رسمی علماء فوق کل ذی علم علیم کو فراموش کئے ہوتے ہیں۔ جو ناقص فقیر ان
علوم کی معرفت کا دم مارے وہ عارفوں کے نزدیک کاذب ہے۔ اور امتحان
کے وقت ذلیل و شرمندہ ہوتا ہے اور قیامت کے روز ایسے مدعیوں
کا منہ سیاہ ہوگا۔ اللہ تعالےٰ رحم کرے۔ اس پر جو اپنا رتبہ پہچانتا ہے (اور
جھوٹے دعوے بھی نہیں کرتا اپنی شیخی نہیں بگھارتا۔ اور اپنے مرنے کے بعد اپنے
شاگردوں کو تابوت و ستر و روضہ وغیرہ علامات مشیخت کے بنانے کی تکلیف
میں نہیں ڈالتا۔ جب یہ معلوم ہو چکا تو اب جاننا چاہیئے کہ فقیر کی علامت یہ
بھی ہے کہ وہ قرآن و احادیث وغیرہ علوم ظاہریہ شریعت سے پورا واقف
ہو کر اس قوم کے راستے میں قدم رکھتا ہے۔ ورنہ اس پر زندیق و بدعتی ہونے
کا خوف ہوتا ہے۔ کیونکہ سالک پر اس راستہ میں ایسے امور منکشف ہوتے
ہیں جو شریعت کے ظاہر کے موافق نہیں ہوتے۔ مثلاً لَافَاعِلَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا مَالِکَ
اِلَّا اللّٰہُ وَلَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (کہ اللہ ہی ہر ایک چیز کا فاعل ہے اور اللہ ہی مالک
ہے اور موجود اللہ ہی ہے) کی حقیقت کھلتی ہے۔ اگرچہ یہ امور حق ہیں لیکن

ان سے یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں انسان مجبور ہے۔ اور وہ خود ہی آمر (امر کرنے والا) ہے اور خود ہی مامور (حکم کیا ہوا محکوم) ہے جس سے تکالیف شرعی الٹھتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کے پاس میزان شرعی ہوگی تو وہ ان امور کو تولے گا۔ اور ان کے مواضع و مواقع کو سمجھے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقر کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ اور اس کے راستہ میں بڑی گڑھے اور ٹیلے و سانپ وغیرہ مصائب ہیں اور سالک نہیں جانتا کہ اس میں کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ اسی واسطے اس میں چلنے کے لئے رہبر کی ضرورت ہے اور وہ شریعت کا نور ہے۔ مگر اس نور سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ جو نور بصیرت رکھتا ہو کور باطن نہ ہو۔ محض نور شریعت سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے (نُورٌ عَلٰی نُورٍ) ذی نور والا ہی نور سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ طریق فقر میں داخل ہونے سے پہلے عقائد اہل سنت سے واقف ہو اور خداوند تعالیٰ کو عن است جسمیت و فوق العرش وغیرہ لوازم مادیت سے مبرا جانتا ہو کیونکہ جو شخص خدا تعالیٰ کو مادی عرش پر مادی طور سے بیٹھا ہوا سمجھتا ہے۔ وہ بتوں کا پجاری ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ قدیم ہے اور عرش مخلوق ہے۔ اور خدا کے کلام بھی قدیم ہیں (اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی) اس وقت کا کلام ہے جب کہ عرش کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ تو اگر عرش کو خدا تعالیٰ کا محل قرار دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ عرش کی پیدائش سے پہلے خدا تعالیٰ کا محل کیا چیز تھا۔ پس جو چیز عرش سے پہلے ہوگی وہی اس کے بعد ہوگی اسی طرح دیگر آیت متشابہات کی تاویل کرتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ جب تک تقلید کے درجہ میں

رہتا ہے اس وقت سوائے کامل عارفوں کے کلام کے دوسرے ناقص لوگوں کے کلام کا مطالعہ نہیں کرتا کیونکہ کاملوں کے کلام یکساں ہوتے ہیں۔ اور ناقصوں کے کلام مختلف اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ہوتی ہے۔ اور فقیر کو یہ باتیں کہ فلاں کا یہ قول ہے اور فلاں نے یوں لکھا ہے مفید نہیں ہوتیں۔ فقیر جب تک خود صاحب حال نہ ہو۔ قال اس کو فائدہ نہیں دیتی بلکہ ناقصوں کے کلام سے خدا کے ساتھ قلت ادب ہو جانے کا اندیشہ ہے اور کاملوں کے کلام سے خدا تعالےٰ کا پورا ادب اور اس کی مخلوق کے ساتھ شفقت کرنے کا عمدہ سبق حاصل ہوتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اپنے نفس سے لوگوں کے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ یعنی لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہے اور اپنے نفس کے لئے خلقت سے مطالبہ نہیں کرتا۔ یعنی لوگوں سے اپنے حقوق نہیں مانگتا۔ پس اگر اس کے اصحاب میں سے کوئی اس کی مجلس میں نہ آئے اور اس کے تقرب سے فائدہ اٹھا دے اور آمد و رفت ترک کر دے تو وہ اس کو برا نہیں مانتا اور اس سے خفا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر ان کے واسطے اس کی صحبت اچھی تھی تو وہ خود ہی نیکی سے باز رہے ہیں اور اگر بری تھی تو بہتر ہوا کہ برائی سے بچ گئے۔ اور بزرگ جو کسی نیک کام چھوڑ دینے پر متاسف و مکدر ہوتے ہیں وہ اس کی مصیبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے نہ اس خیال سے کہ وہ اپنے واسطے ان سے خفا ہیں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اپنے آپ کو ناچیز حقیر خیال کرتا ہے اور غریب خلق سے بھی خود کو بہتر نہیں جانتا بلکہ اپنے آپ کو مطلقاً تمام مومنین سے حقیر خیال کرتا ہے۔ اور کسی کو دستہ وغیرہ چومنے کی اجازت نہیں دیتا اور کوئی اس کے منہ پر [illegible] ہاتھ [illegible] کیونکہ وہ خفت [illegible]

ہیں نہ بندے کے۔ اور اگر کسی شاگرد کو ہاتھ چومنے کی اجازت دیتا ہے تو ایسی حالت میں دیتا ہے جب کہ اس کے دل میں بڑائی کا خیال نہیں ہوتا اور سمجھتا ہے کہ اس سے شاگرد کی مراد بھی غایت تواضع و انکسار ہے۔ پس ایسی صورت میں جب کہ پیر کی نیت میں بڑائی کا خیال نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو احقر مخلوقات سمجھتا ہو۔ اور مرید کی غرض محض تواضع و فروتنی کی مشق ہو) بوسہ دینا کچھ نقصان نہیں کرتا اور صدق و کذب علامات سے معلوم ہو جاتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ ایسے امور میں ایک حالت پر نہیں رہتا گاہے اجازت دیتا ہے اور کبھی منع کر دیتا ہے۔ یعنی جس حالت میں نفس کو مغلوب پاتا ہے۔ اجازت دیتا ہے اور جس صورت میں نفس کا غلبہ دیکھتا ہے اور نفس بزرگی و عزت کا طالب معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت منع کر دیتا ہے لیکن واجب یہ ہے کہ وہ اس کام سے لوگوں کو جزماً منع کرے تاکہ عزت شریعت و ناموس ملت قائم رہے ورنہ اس کو بھی چاہیئے کہ وہ لوگوں کے ہاتھ چومے جیسا کہ وہ اس کے ہاتھ چومتے ہیں۔ نہیں تو ضرور پایا جائے گا کہ وہ اپنے نفس کو دوسروں سے اعلیٰ سمجھتا ہے اور جب نفس اس قسم کی تعظیم و لوگوں کی آمد و رفت سے عادی ہو جاتا ہے۔ اور لوگوں سے خوشامد و مدح کے الفاظ سنتا ہے۔ تو وہ تکبر و بڑائی میں بڑھ جاتا ہے۔ پھر اس پر ان باتوں کا ترک مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور جب لوگ آنا چھوڑ دیں اور ہاتھ چومنا ترک کر دیں اور اس کی خدمت میں کوتاہی کرنے لگیں تو اس کا دل خفا ہوتا ہے۔ اور نفس تلملاتا ہے۔ پھر نفس اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ لوگوں کو ایسی حرکت [illegible] سزا دے جن سے ادب کی تحریک و تحریض پائی جائے۔ اور اس کی نیت یہ ہوتی ہے۔ کہ لوگ میری تعظیم

کریں۔ اور ظاہر میں زبان سے یوں کہتا ہے کہ ہمیں کسی کے آنے جانے کی پروا
نہیں ہے فقیر ہر حال میں مست رہتا ہے۔ لیکن اس کے دل سے پوچھیے تو
وہ اس سے پھٹا جاتا ہے۔ اور دل سے یہی آرزو ہے کہ لوگ سب سے
بڑھ کر میری تعظیم کریں۔ لیکن صراحتاً نہیں کہہ سکتا کہ لوگ میری تعظیم نہیں
کرتے ان کو ادب و توقیر کرنی چاہیئے کیونکہ ڈرتا ہے کہ اگر صراحتاً اس کی
درخواست کی جاوے گی تو لوگ حقیر سمجھیں گے اس واسطے حکایتاً و اشارتاً بتاتا
ہے۔ اور ارادہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ میری تعظیم کریں اور اگر کسی دوسرے ہمسر
کا بھی یہی حال دیکھتا ہے کہ لوگ اس کی چنداں تعظیم نہیں کرتے تو خوش ہوتا
ہے۔ اور چاہتا ہے کہ صرف میں ہی قابل تعظیم مانا جاؤں اور اپنی تعظیم کی زیادتی
کے لئے سناتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایسے تھے کہ جب
آپ کے گرد بیٹھتے تھے تو حیا و ادب سے سر نہیں اٹھاتے تھے (کَاَنَّمَا عَلٰی رُؤُ
سِہِمُ الطَّیْرُ) اور فلانے شیخ و فلاں بزرگ کے اصحاب ادب و تعظیم میں
ایسے تھے اور یہ نہیں سمجھتا کہ چہ نسبت خاک را با آدم پاک ان بزرگوں کے
دل شہرت و ادب و تعظیم کی کدورت سے پاک تھے۔ اور یہ ان کا خواستگار
وہ محض خدا تعالیٰ کے بندے تھے نفسانیت کا ان کے دل پر ذرا اثر نہ تھا
اور یہ بندۂ نفس خواہشات نفسانی میں غرق عبودیت کے احاطہ سے خارج
ہے "کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی"۔ اگر اس قسم کا بزرگ یہ عذر کرے
کہ میں اس واسطے ہاتھ چومنے سے منع نہیں کرتا کہ اس طریق سے ان میں تواضع
و انکساری کی صفت پیدا ہوگی۔ تو یہ بات تب قابل تسلیم ہو سکتی ہے کہ وہ
ان کو ایسے شخص کے ہاتھ چومنے کی ہدایت کرے جن کو وہ حقیر سمجھتے ہیں۔ علاوہ
اس کے ان کا ہاتھ چومنا اپنی صفت انکساری کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے بجائے

اپنے لئے باعث افتخار ذریعہ عزت سمجھتے ہیں تو اس خود پسندی فعل سے لوگوں و دیگر شاگردوں کی تواضع و فروتنی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے اس بات کو خوب سمجھ اور ہر حال میں نفس کے فریبوں اور حیلوں سے غافل نہ ہو۔ اگر نجات کا طالب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت نگہبان ہے۔ اللہ گنہگاروں کو ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے۔

دیگر علامت یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کے درجہ کے موافق جگہ دیتا ہے اور ہر شخص کی قدر و منزلت پہچانتا ہے اور اس میں نہایت ہوشیاری و عقلمندی سے کام لیتا ہے نہ تقلید سے پس سب سے زیادہ قابل عزت و حرمت وہ شخص ہے۔ جو اپنے افعال و اخلاق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ متبع ہے اس امر کا اعتبار نہیں کہ کسی فقیر کے پاس لوگوں کا زیادہ ہجوم ہوتا ہو اور خلقت اس کی بہت تعظیم کرتی ہو اور اس کی صلاحیت و ولایت کا آوازہ لوگوں میں مشہور ہو۔ کیونکہ ایسا شخص اگر اتباع کے زیور سے آراستہ نہیں ہے تو قابل عزت نہیں ہو سکتا۔ میرے بعض مشائخ ایسے تھے کہ ان کے پاس کوئی نہیں آتا تھا اور شان و شوکت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی مجلس میں کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ حالانکہ بڑے بڑے مشہور مشائخ ان کے شاگردی کے قابل بھی نہ تھے۔ کیونکہ وہ اس طریق کے کلام کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے اور شاگردی کی تعریف یہ ہے کہ شیخ کا کلام سمجھ سکے۔ جو شخص قوم کے الفاظ از بر کئے ہوئے ہے اور ان کی حقیقت و اصل منشا نہیں سمجھتا وہ شاگرد بننے کے قابل نہیں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جو لوگوں سے تکلیف برداشت کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت و نعمت سمجھتا ہے اور شکر کرے۔

مائل نہیں ہوتا اور نہایت صبر و تحمل سے مصائب کو برداشت کرتا ہے۔ خود بھی
ابتداء حال میں۔ سیدی ابوالحسن شاذلیؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت
اپنے انبیاء و اصفیاء کے ساتھ یوں جاری ہے کہ ابتداء امر میں ان پر
تکالیف و مصائب آتے ہیں اور آخر میں فتح و غلبہ و حشمت و شوکت ان
کے شامل حال ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سیدنا نوح علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام
و یوسف علیہ السلام و محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے واضح
ہے۔ نوح علیہ السلام نے صبر کیا اور آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم
کو غرق کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو ان کے صبر کے بدلہ میں فرعون اور اس کے
لشکر کا غرق ہونا دکھلایا گیا۔ یوسف علیہ السلام نے صبر کیا اور مصر کی سلطنت
پائی اور اس کے بھائی وغیرہ اس کے آگے محتاج ہوئے۔ اور ایسے ہی
ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب ان کی قوم نے مکہ سے نکال دیا تو
اللہ تعالیٰ نے ان کو تلوار کے زور سے غالب کر کے پھر اس میں داخل کیا۔
ایسے ہی سلف صالحین کا حال تھا۔ لیکن بعض بزرگ ایسے ہوتے ہیں کہ
ان پر ساری عمر تکلیف رہتی ہے اور زندقہ و کفر و الحاد وغیرہ امور باطنہ
و اوصاف آثمہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور یہ ان کے واسطے
کامل ایذا ہے۔ اگر وہ ظاہری گناہوں (مثل چوری جھوٹ۔ مکر و فریب
و کسی کو ستانا۔ نماز نہ پڑھنا روزہ نہ رکھنا وغیرہ) کی طرف منسوب کئے
جائیں تو اس سے انہیں اس قدر تکلیف نہیں ہوتی۔ کیونکہ اول تو فقراء اکثر
ظاہری گناہوں سے منزہ ہوتے ہیں اور اگر کوئی ان امور کو ان کی طرف
منسوب کرے تو چنداں اس نسبت کی پرواہ نہیں کرتے لیکن امور باطنہ
کی نسبت کو کامل تکلیف خیال کرتے ہیں اور بعض بزرگوں کی طرف کچھ

تمسہ عمر تک عقائد باطلہ و خیالات کاذبہ منسوب کئے جاتے ہیں اور اس
میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف منسوب کرنا چاہتا ہے۔
اور لوگوں کی محبت ان کے دلوں میں محو و زائل کرتا اور اپنے محبت سے معمور
کرتا ہے۔ کیونکہ اگر لوگ ان کی طرف رجوع کرتے اور اکثر لوگوں کا ہر وقت
جمگھٹا رہتا تو ان کی نسبت بھی لوگوں کے ساتھ ہو جاتی حالانکہ اللہ تعالےٰ
غیور ہے وہ بندے مومن کے دل میں اپنے سوا غیر کی محبت نہیں چاہتا کیونکہ
مومن کا دل عرش رحمٰن ہے اور اسی پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ اسی واسطے
لوگوں کی محبت و مخالطت سے انہیں نقصان پہنچتا ہے اور دشمنوں کی عداوت
و جدائی سے انہیں فائدہ ہوتا ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ دشمن جو باعث تقرب و
توسل ہو اس دوست سے اچھا ہے جو موجب فرقت و حجاب ہو۔ اس مقام کو
سمجھ اور متکلم کی منشار کے برخلاف مطلب سمجھنے سے پرہیز کر جو مخالفوں کے ایذا،
و تکالیف کا متحمل ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حال و قال سے
مخلوق کے دلوں پر تصرف کرتا ہے اور آخر میں اسے بھی دولت نصیب ہوتی
ہے۔ کیونکہ عبد مومن کے لئے دنیا میں ظاہری دولت نہیں ہوتی۔ کیونکہ دنیا دار
المحن ہے اس میں نیکوں کے واسطے سوائے مصائب و تکالیف کے اور کیا ہے
اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ مومن بندے کو انبیار و اصفیار و سلف صالحین کی اقتدار
سے ایذار و مصائب برداشت کرنی پڑتی ہیں پس جو شخص ایسا ہوتا ہے۔ اللہ
تعالےٰ بغیر کسی ظاہری اسباب کے و بغیر مدد اس کے خویش و اقربا کے اس
کی مدد کرتا ہے۔ یا تو اسے مصائب کے تحمل کا حوصلہ دیدیتا ہے اور وہ
ان کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور اس کا دل ان سے متاثر نہیں ہوتا یا کسی دوسرے
اسباب سے اس کی دستگیری کرتا ہے۔ حکایت ہے کہ ابو یزید بسطامی رضی اللہ عنہ

کے شہر کے لوگ انہیں زندیق وملحد کہتے ہیں اور خیال کرتے تھے کہ یہ ظاہر میں مسلمان ہے اور باطن میں کافر ہے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ایسے مقام پر کھڑے ہوتے جہاں ان کی مذمت ہو اور جہاں انہیں مدح وتعریف کا گمان ہوتا وہاں سے الگ ہو جاتے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس قدر کسی بزرگ کے منکر زیادہ ہوتے ہیں اور مخالف ودشمن بہت ہوتے ہیں۔ ان کو انبیاء علیہم السلام کی پیروی کا سبق ملتا ہے۔ لیکن تمام مومنین کا مخالف ہونا اس کی شقاوت کی علامت ہے۔ کیونکہ تمام مومنین گمراہی پر جمع نہیں ہوتے۔ یعنی جس کے چار مومن بھی کم از کم معتقد نہ ہوں وہ ضرور شقاوت کے احاطہ میں ہوگا۔ جاننا چاہیئے کہ دنیا اعمال کی جزاء کے ظاہر ہونے کی جگہ نہیں ہے یہ تو دارالاعمال دارالافعال ہے۔ ہر ایک یہاں اپنے اپنے خیال میں مشغول ہے اور اپنے حال مست اور ان کی جزاء کے واسطے دوسرا مکان ہے۔ جو شخص یہ حالات سمجھ لیتا ہے وہ لوگوں کے بُرے بھلے کی پرواہ نہیں کرتا اور خلقت سے کسی بدلہ کی امید نہیں رکھتا۔ اس واسطے کامل اپنے کمالیت کی ترقی میں لگ جاتے ہیں اور دنیا میں اس کے نتیجہ ظاہر ہونے کے طالب نہیں ہوتے۔ ان کا کمال اپنے وقت وموقع پر ظاہر ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو دیکھو کہ باوجود کمال رہتے وعلو ترقی کے ان کے کمال کی حقیقت تمام مخلوقات پر نہیں کھلی۔ البتہ آخرت میں ان کا کمال ہر خاص وعام وہر کس و ناکس پر ہویدا ہوگا ایسے دوسرے کاملوں کا کمال بحسب المراتب دار آخرت میں ہی ظاہر ہوگا۔ پس جو شخص دنیا میں نتائج کا ظہور چاہتا ہے۔ وہ بے محل بات کا طالب ہے۔ اور آخرت کو دنیا کے عوض بیچتا ہے۔ سیدی ابوالحسن شاذلی کا قول ہے کہ اللہ تعالےٰ جب جانتا تھا کہ اس کے انبیاء و

واصفیا پر اعتراض کئے جاویں گے اور لوگ انکار کریں گے تو ان کی تسلی کے
واسطے ایک ایسی شق توجیہہ کر دی جو خدا کی طرف بھی بیوی بچوں کو منسوب
کر لے گی تاکہ انبیا کو تسلی رہے کہ جب خدا بھی منکروں کی زبان سے نہیں
چھوٹا تو ہم کیا ہیں۔ پس بزرگوں کو بھی منکروں کے اعتراضوں کو ٹھنڈے دل
سے ماننا چاہیئے۔ بلکہ مخالفوں کو اپنے حق میں خدا کی رحمت سمجھنا چاہیئے کیونکہ
اگر معاملہ برعکس ہوتا اور وہ بھی منکروں کی طرح ہوتا تو کیا ہو سکتا - پھر
شکر کرنا چاہیئے کہ گروہ منکرین یا ناقصین سے نہیں بنایا گیا۔ اور یہ بھی یاد
رہے کہ اگر کوئی خدا کے نزدیک نیک نہیں تو لوگوں کی تعریف و توصیف
سے کیا ہو سکتا ہے اور اگر وہ خدا تعالے کے نزدیک اچھا ہے۔ تو لوگوں
کی مذمت و تکلیف سے اس کا کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ اور منکر و مخالف
کسی کا کیا بگاڑ سکتے ہیں اس کا معاملہ اس کے ساتھ ہوگا اور مخالفوں کا ان
کے ساتھ یہ سب جھگڑے زندگی تک ہیں موت سے سب علاقے منقطع ہو جاتے
ہیں۔ قبر میں کسی کو کسی کے بدلے سوال نہیں ہو سکتا اور حشر و نشر میں ہر ایک کو
اپنا ہی حساب دینا ہوگا۔ یہ بھی یاد رکھ کہ جب لوگ تیری تعریف کریں تو تو
تواضع ظاہر نہ کر اور جب تیری تعظیم کریں تو تو اپنے نفس کو حقیر نہ دکھا ورنہ تیری
زیادہ تعظیم کریں گے بلکہ خاموش رہ تاکہ ان کو یہ وہم و خیال پیدا ہو کہ یہ اپنی تعریف
کو ناپسند کرتا ہے - اس طرح سے وہ خود تعظیم میں کمی کر دیں گے اور یہ
تیرے حق میں بہتر ہوگا۔ اگر شیطان تیرے دل میں یہ ڈالے کہ اس طرح کرنے
سے لوگ متفرق ہو جاویں گے اور تو ان کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گا اور نیکی و
خیریت کی تلقین نہیں کر سکے گا - تو اس کو کہنا چاہیئے کہ میری نظر ان کے محرک
(اللہ تعالے) پر ہے - اگر خدا نے ان کے نصیب میں میری تعظیم قائم کر دی

ہے۔ تو ممکن نہیں کہ میری حقارت کر سکیں اور اگر ان کے باطن میں میری تحقیر ڈال دی ہے۔ تو ممکن نہیں کہ میری تعظیم کریں۔ اگرچہ میں انہیں ہر ایک قسم کی کرامت بھی دکھاؤں۔ حاصل یہ کہ جس شخص کا ارادہ یہ ہو کہ لوگ میری تعظیم و توقیر کریں تو وہ ہمیشہ رنج و غم میں رہتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ممکن نہیں کہ کوئی کسی کا مخالف نہ ہو اور اس کا یہ خیال (کہ تمام لوگ میری طرف متوجہ ہوں اور میری مدح و تعریف کریں) جہالت ہے۔ کیونکہ دنیا میں خواہ کیسا ہی کوئی کامل کیوں نہ ہو اور مرتبہ میں اگرچہ صحابہؓ کے برابر ہی ہو تو بھی کوئی اس کا مدح کرنے والا ہوگا اور کوئی مذمت کرنے والا۔

ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کیا کرتا تھا ایک دن آپ کی اس سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ اس نے صحابہ کرامؓ کے سامنے ان کی تعریف شروع کی آپ نے فرمایا (اَنَا دُوْنَ مَا تَقُوْلُ وَفَوْقَ مَا فِیْ نَفْسِكَ) یعنی جو تعریف تیری زبان پر ہے۔ اس سے تو میں کم ہوں اور جو مذمت و حقارت تیرے دل میں ہے اس سے بڑھ کر ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کے علم اور تقدیر پر راضی رہتا ہے۔ وہ ہر حال میں یکساں رہتا ہے اور اس کی حالت میں تغیر نہیں آتا اگرچہ ہر دو جہان کے لوگ اس کی مذمت و حقارت کریں اور کبھی نہیں اتراتا اگرچہ سارا جہان اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ بلکہ وہ مطلقاً لوگوں کے اقوال کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ میں نے ہاتف کی زبان سے سنا کہ وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے کہہ رہا تھا کہ جو شخص میرے تمام امور و اسرار کا مشاہدہ کر لیتا ہے وہ رنج و راحت و آسائش و تنگی وغیرہ حالات میں متغیر و متاثر نہیں ہوتا۔ اور جو شخص میری درگاہ سے نکل جاتا ہے اس پر اپنے دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہوں۔

دیگر اس کی علامت یہ ہے کہ جب وہ کسی کو امر بالمعروف کرتا ہے یا کسی
کام سے منع کرتا ہے اور وہ امر کو بجا نہیں لاتا اور نہی سے باز نہیں رہتا تو وہ
اس سے مکدر و رنجیدہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا کام صرف ابلاغ
ہے نہ ہدایت مَا عَلَى الرَّسُولِ اِلَّا الْبَلَاغ ۔ پس جب تک اللہ تعالےٰ
بندہ کے واسطے معصیت پیدا کرتا رہتا ہے۔ ممکن نہیں کہ وہ توبہ کر سکے لیکن
جب وہ معصیت پیدا کرنا چھوڑ دیتا ہے تو بندہ بھی ضروری معصیت چھوڑ
دیتا ہے اور توبہ کرتا ہے۔ اسی واسطے قیامت کے روز خدا کی رحمت وسیع
ہوگی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ان کی زبانوں سے نکلا تھا اس کو میں نے
ہی ناطق کیا تھا اور جو کچھ ان کے دل میں آیا تھا وہ میں نے ہی پیدا کیا تھا۔
سبحان اللہ کیا ہی حکیم و عادل و لطیف و خبیر ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور
اس کو کوئی نہیں پوچھ سکتا پس معلوم ہوا کہ امتثال کا کام خدا تعالےٰ کی
طرف راجع ہے اگر اس کی قسمت میں امتثال ہے تو ضرور حکم بجا لائے گا ورنہ
انسان کی کیا طاقت ہے کہ اس کے حکم کی مخالفت کر سکے اور ایسی چیز کا ارادہ کرے
جس کا خدا نے ارادہ نہیں کیا۔ جب یہ معلوم ہوا تو چاہیئے کہ امر بالمعروف و نہی
عن المنکر ملائمت و مرافقت سے کیا جاوے اور کسی کو کسی حال میں حقیر و
ذلیل خیال نہ کیا جاوے۔ کیونکہ انسان قبضہ قدرت میں ہے اور تقدیر کے احکام
کا مظہر و محل ہے اور اسے چارہ نہیں ہے۔ لیکن واعظ کی طرف سے نرمی و محبت
ہوگی تو دوسرا ضرور اطاعت کرے گا اور شکریہ احسان بجا لاوے گا۔ کیونکہ "دل
را بدل رہیست" کا مضمون ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے کہ جب نفسانیت
اور حقارت و سختی سے امر کیا جاوے تو مخاطب پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور وہ بھی نفسانیت
و ضدیت سے پیش آتا ہے اور سوائے انکار و سرکشی کے کچھ حاصل نہیں اور

یہی اکثر دیکھا جاتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ کسی کو کسی کام کے کرنے میں یہ نہیں کہتا کہ کیوں کیا اور کسی امر کے ترک میں یوں نہیں کہتا کہ کیوں ترک کیا۔ کیونکہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انس کو کسی کام میں نہ کبھی یہ کہا تھا کہ کیوں کیا اور نہ کبھی یہ کہ کیوں چھوڑا۔ اور اس میں اللہ تعالےٰ کا ادب ہے نہ کام کرنے والے کا۔ کیونکہ کسی کام کا کرنا یا ترک کرنا اللہ تعالےٰ کی مشیت اور ارادہ پر موقوف ہے۔ یہ ادب اہل اللہ کرتے ہیں کیونکہ وہ دنیا کے ہر ایک واقع میں اللہ تعالےٰ کی حکمت و باعث کو سمجھتے ہیں اس واسطے وہ کسی پر اعتراض نہیں کرتے۔ لیکن ابتدار اعتراض کے چھوڑنے اور بعد تامل و فکر کے اعتراض ترک کرنے میں بڑا فرق ہے۔ وہ لوگ جو درجہ اہل اللہ تک پہنچے ہوئے ہیں وہ ابتدار اعتراض ترک کر دیتے ہیں اور جو لوگ اس درجہ تک نہیں پہنچے وہ ابتدار حال میں بباعث حجاب وعدم واقفیت حکمت اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں شرع نے حکم دیا ہے کہ کسی سے انکار کریں اور کسی کا اقرار کریں اور کہیں کہ فلاں کام کا ترک اولیٰ ہے اور فلاں کام کا بجالانا بہتر ہے۔ اگرچہ یہ بات حق ہے لیکن قائل اللہ تعالےٰ کی حکمت سے جاہل ہے۔ لیکن جب اسے علم وحکمت و معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت میں اگر وہ اعتراض کرے تو اس کا اعتراض بجا ہوگا کیونکہ اس حالت میں اس میں نفسانیت نہیں ہوگی اور اس حالت میں اللہ تعالےٰ کے اعتراض کا ناقل ہوگا نہ خود قائل۔ پس ایسے شخص کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا درجہ حاصل ہے اور اسے جائز ہے کہ وہ حدود شرعی قائم کرے اور لوگوں کو امور ظاہرہ شرعیہ کی طرف بلاوے کیونکہ وہ اس حالت میں نفس کی اطاعت سے

آزاد ہو کر ہر ایک امر کو محض خالصاً لوجہ اللہ و استرضاءِ مرضات اللہ کرے گا
اور خود پرستی و خود غرضی و اپنی عزت و بزرگی کا اسے ذرا خیال نہیں ہوگا۔
اور ہر چیز میں اللہ کا جلوہ دیکھے گا اور وہ (تکن کانک تراہ) کا مصداق
ہو جائے گا یعنی وہ خود اللہ تعالےٰ کو دیکھتا ہے۔ اور یہ اس سے بہتر ہے
جو (فان اللہ یراک) کا مصداق ہے یعنی جو شخص اس منزل تک پہنچ گیا ہے
کہ وہ خود اللہ کا مشاہدہ کرتا ہے وہ بہ نسبت اس کے بہتر ہے جو اس درجہ
تک نہیں پہنچا بلکہ اس درجہ میں ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے۔
ذرا اس مقام پر غور کر کہ یہ درجہ صدیق اکبرؓ کا ہے۔ جب یہ معلوم ہو چکا تو
تمہیں چاہیئے کہ اگر تو کسی کو کسی کام سے منع کرنا چاہیئے تو اس کو یوں نہ کہو
کہ تو نے فلانا کام کیوں کیا بلکہ یوں کہو کہ فلانا کام پھر نہ کرنا اور توبہ کر اور
خدا کی طرف رجوع کر (امر کرنے والا) کا اتنا ہی کام ہے نہ ہدایت کرنا کیونکہ
اللہ تعالےٰ اپنے امر پر غالب ہے۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگرچہ وہ فقراء صادقین کے درجہ
سے ابھی قاصر ہے تاہم وہ اگر مثلاً کبھی بیمار ہو جاوے اور اس کے احباب
اس کے مرض میں اعانت نہ کریں وہ ضروریت و حوائج مرض سے اس کی مدد
نہ کریں تو وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا اور شکایت نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے
کہ اگر وہ بات ان کے حق میں خیر تھی اور ان پر حق اخوت اسلامی تھا۔ تو انہوں
نے ہی خیریت و نیکی کو ترک کیا ہے۔ اور اپنے نفس کو ثواب سے باز رکھا
ہے۔ اس کا اس میں کیا حرج ہے اور اگر وہ ان کے لئے باعث بدی و شر
تھا۔ یعنی محض لوگوں کے دکھلاوے اور شہرت و نام کے واسطے عیادت کو
آتے تو بہتر ہوا کہ انہوں نے اپنے نفس کو اس ہوائے نفس سے نجات دی

علاوہ اس کے وہ یہ سمجھتا ہے کہ دوا کی چنداں ضرورت نہیں ہے - اور حکیم
کے پاس جانے اور اس کی فیس ادا کرنے سے یہی بہتر ہے کہ وہی رقم کسی فقیر
عیالدار کو دی جاوے کہ وہ اپنے عیال پر خرچ کرے خصوصاً جب کہ حکیم کو
رباطن و جاہل ہو اور ظاہر و باطن میں تمیز نہ کرسکتا ہو - یہ تو فقراء قاصرین کا حال
ہے - لیکن فقراء صادقین و کاملین و مطلقاً ان باتوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی
نہیں دیکھتے اور کسی حال میں سوائے اللہ کے کسی کا قرب نہیں چاہتے اور مخلوقات
میں سے کسی کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دیتے - کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
سب سے قریب ہے اور مصائب و تکالیف باعث شرافت و طہارت
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہماری بہتری کو بہ نسبت ہمارے اچھا
جانتے ہیں -

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ نفع و نقصان کو سوائے خدا
کے کسی کے ہاتھ میں نہیں دیکھتا اور اگر ساری خلقت اس کی طرف رجوع کر
اور اس سے سلوک و رشاد کا طریقہ حاصل کرے اور اس سے فیض و فائدہ
اٹھائے تو وہ ہدایت کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا ہے کیونکہ وہ اِنَّكَ لَا
تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ ؎ کی حقیقت خوب
سمجھتا ہے - اور علامت اس بات کی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا مرتبہ
اعلیٰ نہیں سمجھتا اور درست بھی یہی ہے - کیونکہ وہ خود شیخ نہیں بن گیا بلکہ
لوگوں نے ہی بنایا ہے اسی واسطے اگر وہ کسی ایسی جگہ جاوے جہاں اس
کو کوئی نہ جانتا ہو اور وہ خود اونچے آواز سے کہے کہ میں شیخ ہوں بزرگ

؎ تو اپنی خواہش کے موافق کسی کو ہدایت نہیں کرسکتا بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے -

ہوں ولی ہوں۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوگا بلکہ مسخری کریں گے اور جب لوگ اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں سر جھکائے جا رہے ہوں تو لوگ خود ہی کہیں گے کہ یہ بڑا بزرگ ولی اللہ ہے۔ اگرچہ کوئی بھی اس کے حال سے واقف نہ ہو کیونکہ شخصیت کی ہیئت لوگوں کے اس کے گرد جمع ہونے سے حاصل ہو چکی ہے۔ اسی واسطے وہ سارا دن لوگوں کے ساتھ ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شیخ ہو تو اس سے دوسرے لوگ ہی بہتر ہیں۔ کیونکہ وہ اکثر اس سے عبادت زیادہ کرتے ہیں اور اس کی بہ نسبت اذکار و اوراد میں زیادہ مشغول رہتے ہیں اور لوگ پھر بھی اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حال اس سے بہتر ہوتا ہے وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگ تقلیداً و شہرت کے سبب سے مشائخ کی تعظیم کرتے ہیں اور جب فقرا ناقص خلقت کی اس حالت کو دیکھتے ہیں تو وہ ابتدا امر میں ہی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کو درجہ مشیخیت و معتقدین کی کثرت حاصل ہو جاوے اور جب یہ بات ہاتھ آجاتی ہے تو نماز روزہ پرہیزگاری وغیرہ اعمال صالحہ چھوڑ دیتے ہیں اور لوگوں کو کہتے ہیں کہ ہمیں ان امور کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم اللہ تعالےٰ سے ایک لحہ بھی غافل نہیں ہوتے۔ اعمال ظاہری تو مبتدیوں کے لئے ہیں پس وہ سارا دن لوگوں کے درمیان بیٹھے رہتے ہیں اور ہنستے ہیں اور ان کے شاگرد سارا دن ذکر کرتے رہتے ہیں اور پڑھتے رہتے ہیں۔ اور لوگوں سے اپنے کو بڑا نہ جاننے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اگر اس کے تمام شاگرد و معتقدین اس سے روگردانی کر کے کسی دوسرے کے پاس چلے جائیں تو اس کی حالت و جمعیت خاطر میں سرِ مُو فرق نہ آوے۔ اور اگر فرق آوے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدا کے ساتھ ربوبیت میں شریک ہونا چاہتا ہے۔

اور عبودیت سے نکلنا چاہتا ہے کیونکہ درجہ عبودیت میں اس کے ہاتھ سے ہدایت ہونا یا کسی اور کے وسیلہ سے ہدایت ہونا مساوی ہے اور حقیقت میں ہادی تو اللہ تعالے ہی ہے۔ پس وہ جس کے ہاتھ سے چاہے لوگوں کو ہدایت کا رستہ دکھائے۔ اور جس شخص کا ایسا حال ہو وہ مشیخیت و سلوک کے رستہ کا رہبر نہیں ہو سکتا بلکہ بیچارہ خود بیمار نادانی است اور اپنے ہی نفس کا علاج اس پر لازم ہے۔ سیدی ابوالحسن شاذلیؒ کا قول ہے کہ جو شیخ اپنی بزرگی کا طالب ہے اور لوگوں کے ادب اور تعظیم کا خواہشمند ہے اور ادب الہٰی کی حفاظت نہیں کرتا اس سے ابلیس ادب میں اعلیٰ و برتر ہے کیونکہ شیطان نے اپنے کو خدا کی کسی صفات مخصوصہ میں شریک نہیں کیا بلکہ یہ کہتا ہے (اِنِّی اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ) میں خدا سے ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کی تو یہ کہ حکم نہ مانا یہ کہ اپنے کو اس کی صفات میں شریک گردانا۔ نافرمانی بہ نسبت شراکت کے آسان ہے اور طلب شراکت نہایت بے ادبی و گستاخی ہے۔

بندہ کو ان مصائب و گستاخیوں میں مبتلا کرنے والی چیز ریاست و سرداری کی محبت اور اس درجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی خواہش کرتا ہے بہ زماں حال کے فقراء کا حال ہے۔ لیکن زمانہ گزشتہ کے بزرگ اس منصب کی تب خواہش کرتے تھے۔ جب کہ درجۂ بقاء کو طے کر لیتے تھے اور صرف رتبہ قلبیت باقی رہ جاتی ہے۔ اور جب کہ وہ (فَبِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَنْطِقُ الحدیث) کا مصداق ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ سیدی شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کا حال تھا۔ اس وقت انسان دعوے سے باز آتا ہے اپنے اقوال و افعال کی حفاظت کرتا ہے۔ مگر جو شخص اس درجہ کے حصول کا دعویٰ کرے

تو انکار نہ کر بلکہ اس کا معاملہ خدا کے سپرد کر۔ اگر جھوٹا ہے، تو اس کا وبال
اس پر ہے اور اگر سچا ہے تو اس کی پیروی و صحبت میں ہمارا فائدہ ہے۔ اور
اللہ تعالےٰ کی رحمتیں کسی خاص بندے پر ہی منحصر نہیں ہیں۔ ولایت میں ظہور
کرامت شرط نہیں ہے۔ صرف امتثال اوامر و اجتناب نواہی شرط ہے۔ اور
کتاب و سنت کی اطاعت واجب ہے۔ پس جو شخص ایسا ہو اس کی ولایت
پر قرآن شاہد ہے اگرچہ اس کا نہ کوئی معتقد ہو نہ کوئی مرید ہو۔ جب یہ باتیں
معلوم ہو چکیں تو اب شیخ کو چاہیئے کہ وہ آپ کو مریدوں سے عزت میں نہ اعلےٰ
و برتر خیال نہ کرے اور یہ نہ سمجھے کہ وہ تو میرے محتاج ہیں اور میں ان کا محتاج
نہیں ہوں کیونکہ یہ جہالت ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مقام فقر سے
واقف نہیں ہے اور نہیں سمجھتا کہ سوائے اللہ کے کسی پر من کل الوجوہ ترجیح
نہیں ہے اور ایسا خیال کرنا شیطان کا کام ہے۔ ایسا آدمی دوسرے کی
تلقین و تعلیم و تربیت کے لائق نہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ مرید میرا محتاج
ہے۔ اور اپنی احتیاج بھولا ہوا ہے اور نہیں جانتا کہ میں بھی خدا کے بندوں
کا محتاج ہوں۔ گویا زبان حال سے وہ خدا سے بے پرواہ ہونے کا اقرار
کرتا ہے اور عزت و تکبر کا طالب ہے۔ لیکن محقق عارفوں کا حال یہ
ہوتا ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ مرید ان سے طریق معرفت کا استفادہ
کرتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کے محتاج ہیں تو وہ اللہ کا شکر بجا لاتے
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرید اس سے اس نکتہ تک پہنچ جائیں گے۔ نیز یہ کہ وہ اللہ
تعالےٰ کے نہایت ہی محتاج ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو یہ بات معلوم نہ ہوتی کہ
ہم کسی کے محتاج ہیں اور اپنی کمزوری کو معلوم نہ کرتے تو اللہ تعالےٰ سے
بھی بے پرواہ ہو جاتے اور اپنی کمزوری و احتیاجی کو بھول جاتے۔ پس

محقق عارف جس قدر اپنا حق مریدوں پر خیال کرتے ہیں اس سے زیادہ
مریدوں کا حق اپنے پر سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم ان کے شیخ ہیں از روئے
قول و تربیت کے تو وہ ہمارے شیخ ہیں از روئے حال و حقیقت کے یہ
مقام ذرا غور و خوض کے قابل ہے اس کو بنظر امعان مطالعہ کرنا چاہیئے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ دنیا کی کسی حالت سے متغیر و منغص
نہیں ہوتا کیونکہ فقیر سے بباعث قرب الٰہی آثار نفسانیت زائل ہو جاتے
ہیں وہ تو ہر وقت مشاہدہ و مراقبہ حق میں مستغرق رہتا ہے۔ اور غیر سے غافل
ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی جگہ خدا سے خالی نہیں ہوتی۔ اس واسطے وہ
ہر چیز کا ادب کرتا ہے اور ہر چیز میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور کوئی ذرہ
اس کے حکم کے بغیر ہلتا نہیں دیکھتا اور یہی اہل قرب کا درجہ اور علامت
ہوتی ہے۔

جنید رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میں دنیا کے مصائب و تکالیف سے
کبھی مکدر خاطر نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ دنیا مصائب کا گھر ہے۔
اور یہی اس کی اصلیت و حقیقت ہے۔ پس جو مصیبت و تکلیف آتی ہے
اس کو اصل خیال کرتا ہوں اور جو کوئی راحت و آسائش حاصل ہوتی ہے
اس کو خلاف اصل و خدا کی رحمت سمجھتا ہوں اور شکر بجا لاتا ہوں۔ قطب
ربانی سیدی شیخ احمد رفاعیؒ کا قول ہے کہ اگر خلقت کے دو حصے کئے جاویں
ایک تو میرے دائیں طرف خوشبوؤں کی دھونی سلگائے اور دوسرا میرے
بائیں طرف مقراض سے میرا گوشت کاٹے تو اس سے مجھے کچھ تکلیف نہ ہوگی اور
اس سے کچھ آرام ہوگا۔ یہ نکتہ یاد رکھو ان کے طریق پر چلو اگر ان سے
ملنا چاہتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ راہ سلوک و طریق معرفت کی تلقین
شاگردوں کو اس حالت میں کرتا ہے کہ ان کو (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ) یوم میثاق
سے جانتا ہو سہل بن عبداللہ تستری کا قول ہے کہ میں اپنے شاگردوں کو
یوم میثاق سے جانتا ہوں اور ان کو بھی پہچانتا ہوں جو میرے ہاتھ سے فائدہ
اٹھائیں گے اور جو نہیں اٹھائیں گے اور ان کو بھی جانتا ہوں جو میرے
دائیں تھے اور جو میرے بائیں تھے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کی یہ
حالت ہو اور درجہ کشف میں اس اعلیٰ درجہ تک پہنچا ہوا ہو اس کے واسطے
جائز ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو دوسرے شیخ کی زیارت سے منع کرے کیونکہ
اہل کشف کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے لیکن
جو اس درجہ کا نہیں ہے۔ اس کو جائز نہیں کہ اپنی ناموس و عزت کے واسطے
شاگردوں کو دوسرے شیخ کی زیارت سے منع کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے
حکم پر غالب ہے اور جو کچھ اس نے اندازہ لگا دیا ہے کہ فلاں فلاں کے ہاتھ
سے فائدہ اٹھائے گا وہ ہو کر رہے گا اور کوئی نفس جب تک اپنا اندازہ پورا
نہ کرے دنیا سے رخصت نہیں ہوتا اور قاصروں کو اس غلطی میں کمالیت کا
دعوےٰ ڈالتا ہے کہ وہ آپ کو عارف کامل خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی
غلطی ہے۔ کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو شناخت کر سکتا ہے۔ اس پر شاگردوں
کی شناخت کیا مشکل ہے۔ پس ایسے لوگوں کا شاگردوں کو دوسرے شیخ
کی زیارت سے منع کرنا جہالت ہے۔ اگرچہ حقیقت میں مانع خدا ہی ہے۔
کیونکہ اگر دوسرے کے پاس جانا شاگردوں کی قسمت میں ہے تو ضرور ہو کر
رہے گا۔ اگرچہ آنا و جانا تقدیر سے ہے لیکن وہ اپنے ارادہ سے ماخوذ ہوگا
پس ناقصوں کو کاملوں کے ساتھ مشابہت نہیں کرنی چاہیئے اور ان کی

طرح شاگردوں کو دوسروں کی زیارت سے منع نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کی کتابوں میں منع کی اجازت ہے حالانکہ وہ یہ نہیں سوچتے کہ وہ اجازت ان کاملوں کے لئے ہے جن کو کشف صحیح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے ہاتھ سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے نہ کہ ناقصوں کے لئے جن کو اپنی بھی خبر نہیں۔

یاد رہے کہ سالک کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ جب سلوک کے رستہ میں کوئی راز اس پر ظاہر ہو یا کوئی اسرار اس کے دل میں القاء ہو تو اس کو اپنے ہم نشینوں میں سے ایسے شخص کے پاس ظاہر کرے جو اس کے سمجھنے کی استعداد و قابلیت رکھتا ہو نہ کہ ہر قابل و ناقابل کے سامنے۔ کیونکہ جو شخص عارفوں کے کلام کا مطالعہ کر کے ہر ایک جلیس کے سامنے ظاہر کرتا ہے وہ ابھی سالک نہیں ہوا اور اس نے وہ ذوق نہیں چکھا جو اس عارف نے چکھا تھا جس کے کلام کا یہ مطالعہ کرتا ہے۔ بلکہ یہ محض طوطا ہے اور الفاظ کا حافظ ہے حقیقت و اصلیت و منشار کلام سے ناواقف ہے اور ذوق کو وہی سمجھتا ہے جو صاحب ذوق ہو اور کام کی حقیقت وہی جانتا ہے جو اس میں پڑا ہو اسی واسطے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں گئے اور امت کے واسطے پچاس نمازیں لائے تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تخفیف کے واسطے واپس کیا کیونکہ وہ بنی اسرائیل میں نمازوں کی کثرت کا مزا چکھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ امت محمدیہ بھی اس بار گراں کی متحمل نہ ہو سکے گی اور اس معاملہ میں بباعث ذوق و تجربہ کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ واقف تھے پس اس سے معلوم ہوا کہ جنید وغیرہ کامل عارفوں کے کلام ہر ایک کے حال کے مناسب نہیں ہیں اور قابل و نامستعد برابر نہیں ہیں اور

یہ ضرور نہیں کہ جو کامل اولیاؤں کے الفاظ کا حافظ ہو وہ ان کے معنا و
ذوق سے بھی واقف ہو کیونکہ کامل کے کلام کو کامل ہی سمجھتا ہے ہر ایک
کامل بھی نا دوسرے کامل کے کلام کو ایک ہی درجہ و رتبہ پر نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ
کوئی دو شخص بھی ایک درجہ عقل و فہم میں مساوی نہیں ہو سکتے اور کوئی شخص
صوفیوں کے کلام کے مطالعہ اور ان کے الفاظ کے جاننے سے صوفی و
سالک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس درجہ کی فہم و فراست نہ رکھتا ہو ہمارے
شیخ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص ہزار سال تک صوفیوں کی ہزاروں کتابوں کا مطالعہ
کرے تو وہ شخص مطالعہ سے صوفی نہیں ہو سکتا جب تک اونٹ سوزن کے
سوراخ میں داخل نہ ہو (یعنی محال ہے) اور جس کے دل پر وہ نور نہ ہو جس سے
حق و باطل پر تمیز ہوتی ہے وہ سلوک کے دروازے میں داخل ہونے کے
قابل نہیں ہے (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا) وجہ اس
امر کی جو شخص آپ کو کامل خیال کرنے لگتے ہیں یہ ہے کہ جب تھوڑا کچھ زمانہ
اپنے مشائخ کی خدمت میں رہتے ہیں اور بسبب عدم قابلیت کوئی حقیقت
ان پر منکشف نہیں ہوتی اور وہ اس انتظاری میں ہوتے ہیں کہ کہیں خلافت
کی اجازت ملے اور جب اجازت حاصل نہیں ہوتی تو ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم سے
مشیخت دور نہ ہو جائے خود ہی مشیخت کا نام اختیار کر لیتے ہیں اور مرید کرنا شروع
کر دیتے ہیں حالانکہ خود درجۂ ولایت سے قاصر ہوتے اور دنیاوی آفت میں
مبتلا ہوتے ہیں پھر شاگردوں کو راہ سلوک و معرفت بتلاتے ہیں اور کہتے
ہیں کہ یہ قواعد مشائخ متقدمین کی کتابوں و رسائل میں درج ہیں اور ان کو

ف: اے ایمان والو اگر تم خدا سے ڈروگے تو تمیز حق و باطل پیدا کر دیگا [illegible] حاصل ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ان کو لکھ لو اور ترجمہ کر لو اور اسی کو خیال کرتے ہیں کہ وہ ان کی مشاہد
کلام کو سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ اگر صفوت و معرفت اسی کا نام ہے۔ تو ہر ایک نحوی
ولغوی بھی صوفی ہے۔ پھر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم علم لدنی (جو اپنی ذاتی لیاقت
وغور و خوض و تقویٰ و مشاہدہ قدرت و تحقیق و تدقیق سے حاصل ہوتا ہے نہ
الفاظ و منقول سے) سے کلام کرتے ہیں حالانکہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو انہوں
نے رسالہ قشیری و عوارف المعارف وغیرہ رسائل سے یاد کئے ہوئے ہوتے
ہیں اور وہ رسائل ان کے شاگردوں کے پاس نہیں ہوتے اس واسطے وہ
نئے الفاظ سن کر ان کے معتقد ہو جاتے ہیں اور ان کو شیخ تصور کرتے ہیں۔ اگر
وہ رسائل ان کے پاس ہوتے تو وہ شاگردوں کو ان کے مطالعہ سے منع کرتے
تاکہ ان کی قلعی نہ کھل جائے اور شاگرد ان کے حق میں بدظن نہ ہو جائیں - واہ
سبحان اللہ انسان تو وہ ہے جو اپنی قدر و منزلت سمجھے اور اپنے اندازہ و درجہ
سے قدم باہر نہ رکھے اور ایسا شخص کبھی ذلیل نہیں ہوتا عربی میں ایک مثل ہے
(مَا هَلَكَ امْرُءٌ عَرَفَ قَدْرَهُ)[1] اور سالک حقیقی وہ ہے کہ اگر وہ تمام کتب
منقولہ مفقود ہو جاویں تو بھی وہ صرف کتاب و سنت سے تمام احکام و
ادب کو مستنبط کر سکے اور جو ایسا نہیں وہ عارف نہیں پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ہم نے
ایک کتاب تالیف کی ہے جس میں اولیاء کے علوم درج ہیں جس کو شوق ہو
اس کا مطالعہ کرے اور اولیاء و سالکین کے مراتب کا اندازہ لگائے۔ سیدی
ابو المسعود ابن ابی العشائر کا قول ہے کہ جس شخص کا دل ہی کتاب نہیں ہے وہ
باب عرفان کے قابل نہیں ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ عارفوں کے نزدیک حق

---

[1] جو اپنی چادر سے زیادہ پاؤں نہیں پھیلاتا۔ رسوا و خوار نہیں ہوتا۔

(راستی) ہمیشہ شب و روز تغیر و تبدل میں ہے۔ ہر زمانہ میں نئے رنگ و جدید
صورت میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس کے وسائل و ذرائع ہر زمانہ کے موافق بدلتے
رہتے ہیں جیسا کہ آیت (کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَانٍ) اس پر شاہد ہے۔ اسی واسطے عارف
کامل شاگردوں کو کتابوں پر ہی اعتماد کرنے اور انہیں قواعد دقیقہ اور مسائل زمانیہ
و جزئیات و تمثیلات کونیہ پر ہی عمل کرنے سے منع کرتے ہیں کیونکہ ہر زمانہ اپنی
گردش کے موافق رجال کو پیدا کرتا ہے اور عاقلوں کے کلام ہر زمانہ میں ان
لوگوں کی قابلیت و استعداد کے موافق ہوتی ہے پس اس وقت میں اس
زمانے کے لوگوں کو جنید و ابو یزید و معروف وغیرہ عارفوں کے اس کلام سے
(جو وہ اپنے شاگردوں کے واسطے ان کی استعداد و تقاضائے وقت کے موافق
کرتے تھے) کیا فائدہ ہے۔ کیونکہ علاج مرض کے مطابق ہونا چاہیئے اور امراض
روحانی و قلبی ہر زمانہ میں نئی ہوتی ہیں پس اس وقت کا علاج جو کسی خاص مرض
کے لئے تھا اس وقت ایسے مرض کو جو اس مرض کے بالکل مخالف ہے کیونکر فائدہ
دے سکتا ہے۔ بلکہ ہر لحظہ میں انسان کی حالت بدلتی رہتی ہے اور اس کے
مطابق امراض جدیدہ پیدا ہوتی رہتی ہیں تو ایسی صورت میں تمام پچھلے وسائل
جزئیہ و مسائل فروعیہ کیونکر مفید ہو سکتے ہیں۔ اہل اللہ صاحب عقل ان نکات
کو خوب سمجھتے ہیں اور یہ درجہ کامل النفس اصحاب کا ہے اور وہ ہر ایک
کی قابلیت کو سمجھ لیتے ہیں اور اس کے موافق اس سے سلوک کرتے ہیں اور
اور فائدہ اٹھانے والے دوسرے میں تمیز کر لیتے ہیں۔ بلکہ وہ مستفید ہونے
والے مستعد شاگردوں کو اس وقت ہی سمجھ لیتے ہیں۔ جب کہ وہ اپنے باپ
کی صلب (پیٹھ) میں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میرے شیخ کو اس کے شیخ نے صلب
میں ہی جان لیا تھا اور یہی واقعہ سیدی شیخ محمد بن ہارون کا سیدی شیخ

ابراہیم دسوقیؒ کے ساتھ ہوا تھا۔ ایسے ہی سیدی ابوالمسعود بن ابی العشائرؒ کو اس کے شیخ سیدی حاتم نے جان لیا تھا اور یہی حال سیدی شیخ محمد مغربی کا سیدی شیخ عبدالرحیم قناوی کے ساتھ ہوا تھا۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ سے پرہیز کرتا ہے جن سے کوئی دعوے یا تزکیہ نفس[1] ظاہر ہوتا ہو۔ مثلاً ہم تو اس وقت سے انسان بنے ہیں جب سے فلانے شیخ کو ملے ہیں (۲) کشف و کرامت تو ناقصوں سے صادر ہوتی ہے کاملوں کو اس سے کیا واسطہ وغیرہ وغیرہ۔ تاکہ حاضرین کو خیال گزرے کہ یہ کامل ہے۔ کیونکہ اس سے کبھی کشف و کرامت ظاہر نہیں ہوئی یا کبھی کشف کا اظہار کیا ہو اور وہ واقع کے مطابق نہ ہوئی ہو جیسا کہ اکثر ناقصوں کا حال ہے۔ کیونکہ گاہے ان پر کوئی امر منکشف ہوتا ہے اور وہ اس کو ظاہر کر دیتے ہیں اور نتیجہ برخلاف برآمد ہوتا ہے حالانکہ وہ اپنی خبر میں صادق ہوتے ہیں لیکن محو و اثبات تو خدا کے ہاتھ میں ہے اور یہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے اور خدا پر کسی کا حکم نہیں وہ کسی کا مقید نہیں جو چاہے کرتا ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ جیسا ہم نے مشاہدہ کیا ہے ویسا ہی ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ کی شان کو نہیں سمجھتے۔ اس واسطے ادب یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے کشف کو ظاہر نہ کرے بلکہ خاموش رہے اگر ظاہر کرے تو اس کا نتیجہ خود نہ نکالے اور اس کی تعبیر میں جلدی نہ کرے جب تک کہ خود خدا کی طرف سے اس کا نتیجہ ظہور میں نہ آوے۔ اگر موافق ہوا فبہا ورنہ ادب سے خارج نہ ہوگا۔ حاصل کلام تو یہ ہے کہ اہل کشف صاحب کرامت عزیز الوجود نادر و کمیاب ہیں۔ کیونکہ عارف کہتے ہیں کہ جس کا کھانا حلال کا نہ ہو وہ وساوس نفسانی و خواطر شیطانی و خیالات رحمانی و کمالات ربانی میں فرق نہیں کر سکتا

اور یہ عزیز الوجود ہے تو بھلا کشف وکرامت کہاں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جو اس پر احسان کرتا ہے اس کے ساتھ للہ و بے غرضانہ محبت کرتا ہے نہ اس کے احسان کے واسطے اور یہ بات ذوق و حالت سے معلوم ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی تمیز بہت ہی مشکل ہے کیونکہ دلوں میں طبعاً اپنے محسن کی محبت مرکوز ہے۔ اس کو ذرا غور سے سمجھنا چاہیئے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر وہ کسی اپنے شیخ یا دوسرے بزرگ کی زیارت کے لئے جاتا ہے تو اس حالت سے زیادہ طمطراق و شان شوکت ظاہر نہیں کرتا جو ہمیشہ معمولی حالت میں ہوتی ہے۔ کیونکہ جس کی زیارت کے لئے جاتا ہے اگر وہ فقیر ہے تو اس کی نظر ظاہر پر نہیں پڑتی وہ باطن کو دیکھتا ہے اور مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور اگر صاحبِ دولت ہے۔ تو (زیارت کرنے والا) کو اپنے ریا کے واسطے اللہ تعالےٰ کے غضب سے ڈرنا چاہیئے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جب کہ اس کے پاس کوئی اس کا مرید ومعتقد آوے اور وہ اس وقت اپنے حال میں ہو جس سے مرید کے اعتقاد میں فرق آتا ہو مثلاً ہنسی و مذاق میں ہو تو چاہیئے کہ اس حال کو نہ بدلے بلکہ ہنسی و مذاق میں مصروف رہے۔ کیونکہ اس میں تو نفس کی مخالفت ہے اور ہنسی و مذاق کے چھوڑنے میں نفاق و ریاء کا خطرہ ہے اور نفس کی مخالفت بہ نسبت نفاق و ریا کے بہتر ہے۔ فضل بن عیاض کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص میرے پاس آوے اور اس کے دخول کے وقت اپنی داڑھی کو ہاتھ سے برابر کروں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا تعالےٰ کے نزدیک منافقوں کے گروہ میں نہ لکھا جاؤں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ ایسی حالت کا طالب نہیں ہوتا کہ

جس سے لوگوں کی آنکھوں میں تو بزرگ معلوم ہو اور خدا تعالےٰ کی آنکھ میں
حقیر۔ مثلاً جبہ و قبہ اور دستار و عمامہ ۔ کیونکہ یہ قلت معرفت کی علامت ہے
اسی واسطے کاملوں نے ہمیشہ خلقت سے اپنے مقام کو چھپایا ہے اور اپنے
درجہ کے اظہار و طلب رفعت و عزت کو اپنے آقا (خدا تعالےٰ) کے ساتھ
الوہیت میں شریک ہونا خیال کیا ہے اور ان کا پوشیدہ ہونا کمال تحقیق کی
علامت ہے۔ کیونکہ ان کا آقا اس کی جگہ میں پوشیدہ ہے۔ جہاں وہ ہیں اسی
واسطے وہ عام لوگوں کے ساتھ عبادات ظاہریہ میں شریک نہیں ہوتے اور
کرامات و خوارق کو چھپاتے ہیں پس ان کے مرتبے کو وہی جانتا ہے جو ان کے
مرتبے میں ہوتا ہے گویا وہ خدا کی بیویاں ہیں کہ اپنے خاوند کے سوا کسی غیر کی
طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں پس کہاں یہ اور کہاں وہ لوگ جو خواہشات
نفسانی کے لئے چلے کاٹتے اور خلوت میں رہتے اور ایسے وظائف پڑھتے کہ
جن سے جن قابو ہو جاویں تاکہ لوگوں کا رجوع ان کی طرف ہو جاوے مگر
ان باتوں سے خدا تعالےٰ کا قرب حاصل نہیں ہوتا بلکہ مفارقت و بُعد (؟)
ہوتی ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ مومنوں کے لئے (تواضع کرتا
ہے) محض اللہ تعالےٰ کے حکم کی فرماں برداری کے لئے نہ کسی اور غرض
کے لئے۔ مثلاً اس خیال سے کہ لوگ کہیں وہ بڑا نیک خلق ہے۔ بزرگ ہے
اخلاق نبوت سے آراستہ ہے نفس کش ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ فقیر ان
تمام باتوں سے فارغ ہوتا ہے پس وہ اپنے شاگردوں سے انکی صلاحیت
و بہتری کے لئے شیریں کلامی سے پیش آتا ہے۔ نہ اس خوف سے کہ وہ متنفر
ہو جاویں گے خصوصاً یہ کام اس وقت بہت ضروری ہے جب کہ اس کا

بباس وطعام ونان ونفقہ مریدوں وشاگردوں پر موقوف ہو۔ اور آجکل
کے فقیر اکثر ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ لوگوں کے صدقات اور
ان کے اوساخ (میل) وہدایا ہیں۔ اور اپنے ہاتھ سے کماکر کھانے والے
شاذونادر ہیں۔ پس فقیر پر واجب ہے کہ حق وہدایت کی تابعداری کرے نہ اپنے
حظوظ نفس کی اور محض اللہ تعالےٰ کے واسطے شاگردوں کو صالحین کے رستہ
کی ترغیب دے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی مرید کسی دوسرے بزرگ
سے کچھ حاصل کرنا چاہے تو اسے منع نہ کرے بلکہ ترغیب دے جیسا کہ اپنے واسطے
اس کو ترغیب دیتا ہے۔ کیونکہ قاصروں وناقصوں کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی
ان کا مریدان سے کسی دوسرے سے فائدہ اٹھانے کے واسطے کہے تو وہ کہتے
ہیں کہ تجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے تو نماز پڑھتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کرتا ہے
علم میں مصروف ہے بس اور کیا چاہیئے لیکن جب خود ان سے کچھ حاصل کرنا
چاہتا ہے تو کہتے ہیں میاں یہ راستہ بڑا کٹھن ہے۔ اس کے امراض بہت
ہیں اور سوائے شیخ کامل ورہبر صادق کے یہ راستہ چلنا مشکل ہے۔ اور
ہزار عیب اس میں نکالتے ہیں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ بہت لوگوں کی زیارت وتعظیم سے
(جس سے نفس کی طاقت بڑھتی ہے) خوش نہیں ہوتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی
کے دل میں اس کی تعظیم نہ ہو اور گمنامی وعدم شہرت کو نعمت ورحمت خیال
کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ لوگ اس کی زیارت کو آئیں بلکہ وہ خود ان کی
زیارت کو جاتا ہے۔ میرے شیخ نے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ تو لوگوں کے
آنے سے پہلے ان کی زیارت کے لئے کوشش کر۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ حرکات ظاہریہ مثل خشوع و
نماز میں کانپنا اور کندھوں کا ملانا و سرنگوں ہونا وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے
اور اندرونی حالت کو چھپاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص ان حرکات کو ظاہر کرتا ہے ۔
باوجودیکہ ان کے روکنے پر قادر ہے ۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے ۔ جو
پاخانہ میں ننگا بیٹھ جاوے اور اس کا دروازہ بند نہ کرے حالانکہ بند کرنے پر
قادر ہو پس جو اسے دیکھے گا لعنت کرے گا۔ عمر بن خطابؓ نے ایک شخص کو
نماز میں کاندھے ملائے ہوئے دیکھا۔ اس کو درہ سے مارا اور کہا کہ افسوس خشوع
کا تعلق دل سے ہے نہ جوارح سے ۔ اگرچہ اس قسم کی حالت اکثر ریا پر دلالت
کرتی ہے ۔ لیکن یہ بھی ضرور نہیں کہ جہاں یہ حالت دیکھی جاوے اس کو ریا پر
محمول کیا جاوے ۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ لوگوں کی بہتری و بہبودی چاہتا
ہے اور ان کو صنعت و دستکاری وغیرہ ذرائع معاش سے روزی حاصل
کرنے کی ترغیب دیتا ہے ۔ اور ولیمہ و صدقہ و خیرات وغیرہ میں بیکار رہنے
سے منع کرتا ہے اگرچہ لوگ اسی کی خواہش کریں۔ کیونکہ وہ اپنی بہتری کے
سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہ بتلاتا ہے کہ جو ساعت انسان کی کسی حرکت میں
صرف ہوتی ہے جس سے وہ آپ کو اور اپنے عیال کو فائدہ پہنچاتا ہے ۔
وہ ہزار ولیموں میں حاضر ہونے سے اچھی ہے ۔ جس میں حاضر ہونا اس پر واجب
نہ تھا ۔ ایسا ہی جائز نہیں کہ وہ ان سے اپنی مجلس میں حاضر ہونے کا معاہدہ ہوئے
کیونکہ یہ جہالت کی علامت ہے ۔ کیونکہ اجتماع و افتراق کے اوقات مقسوم ہیں
اس واسطے معاہدہ نہ لینا ہی ادب الہٰی ہے اور ہر شخص کو اپنے کام میں لگے
رہنا اور وقت کو ضائع نہ کرنا ہی بزرگی ہے ۔ عارفوں کا قول ہے کہ جو شخص

اپنے وقت سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس کی بات کسی کو نفع نہیں پہنچاتی۔ پس
عارف وہی ہے جو لوگوں کو ان کے کاموں اور پیشوں میں ہی سلوک کا راستہ
بتائے۔ کیونکہ دنیا سے الگ ہونا ہرگز فقیری نہیں ہے۔ میں نے عام خیال میں
فقراء کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ اپنے اعمال صالحہ سے دور پڑے ہوئے
تھے اور برے اعمال ان کے ساتھ تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہارے
اعمال صالحہ تم سے جدا پڑے ہوئے ہیں۔ جواب دیا کہ ان کو وہ لوگ لے گئے
ہیں جن کی ہم روٹیاں کھایا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں عبادت کی طاقت ان کے
لقموں سے ہوتی تھی۔ پس اس قوت کا ثواب وہی لے گئے ہیں۔ اس واسطے
شارع نے (عمل بالید) اپنے ہاتھ کی کمائی) کی ترغیب دی ہے۔ اور
عارف کامل بھی ہمیشہ اسی کی ترغیب دیتے ہیں اور جہاں تک ہو سکے دوسروں
کے ہاتھ کی طرف دیکھنے سے منع کرتے ہیں۔ میرا دادا علی الشعراوی ایسا پرہیزگار
تھا کہ بھینس کا دودھ بھی نہ پیتا تھا۔ اس خیال سے کہ حیوان مزدوروں کا مال
کھا لیتے ہیں۔ ایسا ہی ان کبوتروں کا گوشت نہیں کھاتا تھا جو لوگوں کے کھیتوں
سے دانہ چنتے ہیں اور چکی اپنے ہاتھ سے پیستے تھے اور جب پیسنے لگتے تو پتھر کو
اٹھاتے اور اس سے پہلا آٹا صاف کرتے پھر اس کو دھوتے اور پیستے اور آخر
عمر میں شہد کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ مکھی لوگوں کے ملوکہ شگوفوں کو
کھاتی ہے۔

حکایت ہے کہ ایک شخص حسن بصریؒ کے پاس ورع (پرہیزگاری)
سیکھنے کے واسطے آیا۔ آپ نے کہا کہ میں پرہیزگاری کی تعلیم کے لائق نہیں
ہوں۔ کیونکہ میں نے بادشاہوں کا مال کھایا ہوا ہے۔ لیکن تو کوفہ میں جا وہاں
ایک شخص ہے جس کا کھانا ہر طرح سے حلال ہے۔ اس نے ایک گائے پال رکھی

ہے۔ وہ اس کے کھیت میں چرتی رہتی ہے اور اسی کھیت میں اس کے لئے کنواں
ہے جس سے وہ پانی پیتی ہے اور اسی کھیت کے چارہ کو کھاتی ہے۔ اور وہ
ایسے گائے کے دودھ پر گزارہ کرتا ہے۔ وہ شخص اس کے پاس گیا اور اس کو
اسی حالت مذکورہ پر پایا اور اس سے تعلیم ورع کی درخواست کی اس نے
پوچھا تجھے کس نے بھیجا ہے۔ کہا "حسن بصری نے" کہا اللہ تعالیٰ حسن کے حال
پر مغفرت کرے۔ بیشک اس کے ساتھ میرا اقرار تھا لیکن اب میرا حال بدل
گیا ہے اور وجہ یہ کہ ایک دن میں نماز میں مصروف ہونے سے گائے کے
حال سے بے خبر ہو گیا وہ میرے کھیت سے نکل کر میرے ہمسائے کے کھیت
میں چلی گئی۔ جب آئی تو اس کے پاؤں میں اس کھیت کی مٹی تھی جو میرے
کھیت کی مٹی سے مخلوط ہو گئی۔ اب میں اس قابل نہیں رہا کہ مجھ سے پرہیزگاری
سیکھی جاوے۔ دیکھو فقیر یہ ہوتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا شکر کر اگر لوگوں
کی روٹی اور ان کا مال تیرے پاس نہ آوے اور اس کے فوت ہونے پر
غم نہ کھا۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی اصلاح کرتا ہے۔ پھر اپنے
بھائی مسلمانوں کی خیرخواہی ونصیحت میں مصروف ہوتا ہے۔ اور اس سے
کسی قسم کا دعویٰ اور تکبر اور ان سے عزت وتعظیم کا حاصل کرنا مقصود نہیں
ہوتا اور اول اپنے اخلاق کی درستی اس واسطے ہے۔ کہ مغلوب النفس کے
لئے لوگوں کو نصیحت کرنا قبیح ہے (آں خویشتن گم است کرا رہبری کند)
لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ ناصح تمام عیوب سے پاک ہو کیونکہ اس صورت
میں امر معروف ونہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جائے گا اور یہ قباحت صرف
زجر اور توبیخ ہے۔ کیونکہ امر معروف ہر شخص پر واجب ہے۔ اگرچہ وہ خود ایسا

کام کرتا ہو جن سے منع کر رہا ہے۔ کیونکہ اس میں کسی کا فائدہ منصور ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جب وہ راہ سلوک کی تلقین و تعلیم کے واسطے مبتلا کیا جاوے جس کے لائق وہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ تو اسے چاہیئے کہ وہ اس کو کسی غیر کے حوالے کرے اور اپنے واسطے یہ حالت بہتر نہ سمجھے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ نفس اس کی طرف مائل ہو جاوے اور وہ بباعث نہ جاننے ان علامات کے جو تمیز نفس کے واسطے لازمی ہیں۔ ہلاک ہو جاوے اور گمراہی کے گڑھے میں گرے اگرچہ ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں ہے اور اگر کسی کی تلقین اس کے ہاتھ سے ہی ہے۔ مگر حالت کمال تک پہنچنے سے پہلے اس کام کو شروع کرنا بے فائدہ ہے اور بے باکی ہے۔ کیونکہ صوفیہ کے نزدیک تلقین ایسے مرید کو کرنی چاہیئے جس کے حظوظ نفسانی دنیاوی و اخروی مر چکے ہوں اور آج کل عوام کالانعام کے نزدیک تلقین اس بات کی علامت ہے کہ تلقین کرنے والا ولی اللہ ہے۔ پس اس کو چاہیئے کہ تلقین کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک قسم کا ابتلاء و مصیبت سمجھے۔ اگر ضرورت پڑے تو تشبیہہ کے طور پر سکھلا دے نہ حقیقی و ذاتی طور پر اور خدا سے اس سے بچنے کی دعا کرے اور لوگوں کے دلوں کی تسلی کے واسطے ان کے حق میں خدا سے دعا مانگے کہ ان کو خیال سے نجات دے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم اس دروازہ کو کھولنا پسند نہیں کرتے اور خلوت و عزلت کو چھوڑ دے۔ اگرچہ اس میں فائدہ بھی ہو اور مخالطت و مجالست کو بہتر سمجھے) خلوت و عزلت بھی صوفیہ کے نزدیک اچھی ہے اور اس کی وجہ ہے۔ کیونکہ وہ خلقت سے بھاگنے میں آرام پاتے ہیں اور ان کے مشاہدہ و مراقبہ میں ہرج نہیں آتا۔ اور اگر وہ ان میں خدا کی ذات دیکھتے تو ان سے کہتے۔ بلکہ خلوت میں جلوت کرتے کیونکہ جو یہ جانتا ہے کہ اللہ

تعالےٰ ہر چیز کے ساتھ ہے وہ اس سے کیونکر بھاگ سکتا ہے اور عبد کامل بھی
وہی ہے جو ظاہر میں خلقت کے ساتھ ہو اور باطن میں خدا کے ساتھ ہو اور خلوت
کو (اس دلیل سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں خلوت کرتے تھے.
امر مشروع نہیں بنانا چاہیئے کیونکہ بے ادبی ہے۔ اس واسطے کہ ان رموز کے
اسرار کو کامل اولیاء کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور خلوت و ریاضت سے
سلوک کے راستہ پر چلنا صوفیوں اور مشائخ کا طریقہ ہے نہ اصحاب رضی
اللہ تعالیٰ عنہم کا کیونکہ وہ تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی تھے اور
ان کو کسی مقام اور رتبہ کی ضرورت نہ تھی نہ دنیا میں نہ آخرت میں تاکہ اس
کے حصول کی انتظاری کرتے اور یہ بھی یاد رہے کہ اگر خلوت سے اس کا
منشا یہ ہوتا ہے کہ اغیار سے فارغ ہو جاوے تو اغیار تو خلوۃ میں بھی پیچھا نہیں
چھوڑتے کیونکہ اس کا نفس اور مکان کی دیواریں وچھت و فرش و لوٹا و تسبیح
و مصلے و کھانا و پینا تو ساتھ ہی ہے۔ علاوہ اس کے جو شیخ کامل ہوتا ہے اس
کو لوگوں کا ہجوم اور ان کی مجلس خدا کی رویت سے باز نہیں رکھ سکتی۔ پھر
اس کو کیا ضرورت ہے کہ خلوت کرے ورنہ اس کا دعویٰ خلاف ہوگا اور
محض ادعا ہوگا۔ ماسوا اس کے خدا تعالےٰ کے ساتھ ہر وقت خلوت ہو نہیں
سکتی اور ہر وقت محو و مستغرق رہنا محال ہے۔ سوائے قطب غوث کے کیونکہ
اس درجہ میں یہ کمالیت پیدا ہو جاتی ہے کہ خلقت کو چھوڑ کر صرف خدا سے
خلوت کر سکے پس جب وہ (نور) سے ملنے کے لئے اپنے کثیف جسم کو چھوڑتا
ہے۔ تو دوسرے جسم (لطیف) سے جا ملتا ہے اور ایک ہی وقت میں دو
جسموں سے تعلق نہیں رکھ سکتا اور یہ خلوت ان اسرار و رموز سے ہے جو ظاہر
نہیں کئے جا سکتے اور کتاب و سنت میں یہ باتیں وارد ہیں مگر اہل اللہ کے

سوا دوسرے کو واقفیت نہیں ہو سکتی یہ میرے شیخ کا مقولہ ہے۔ اس تقریر سے ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں پر جو خلوۃ کو امر مشروع سمجھتے ہیں انکار کیا جاوے بلکہ مراد یہ ہے کہ خواہ کسی حال میں ہو مگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی طرف رجوع نہ کرے کیونکہ لوگوں کی طرف مائل ہونے سے خدا کی طرف سے حجاب و حرماں ہو جاتا ہے اور لوگوں کے مائل کرنے کے لئے خلوت کرنی نہایت قبیح امر ہے اور زیارت کرنے والے مریدوں وغیرہ کے دل میں اپنی تعظیم و بزرگی کا بٹھانا ہے کہ جب کوئی مرید آوے اور وہ شیخ کو خلوت میں پاوے تو شیخ کے آگے جھکے اور زمین پر سر رکھے اور یہ حالت اہل اللہ کے نزدیک معصیت ہے۔ برخلاف اس کے کہ جب مرید آوے اور شیخ کو ہنسی و مذاق میں پاوے کہ اس وقت نفس کی شرارت کا چنداں اندیشہ نہیں ہے لیکن یہ بھی جائز نہیں ہے کہ خلوت نہ کرنے والا خلوت کرنے والے پر اعتراض کرے کیونکہ کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے (كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ) کیونکہ ہر شخص اپنے خیال کے پیچھے چلتا ہے۔ بلکہ اپنی نفس کی حفاظت کرنی چاہیئے اور اس کے دغدغہ و وسوسہ سے غافل نہ ہونا چاہیئے اور اگر خود سوار ہو اور لوگ اس کے اردگرد پیادہ چلتے ہوں تو اس کو فخر نہ سمجھے بلکہ لوگوں کو منع کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہؓ کو اپنے پیچھے چلنے سے منع کیا تھا اسی طرح ہمیشہ اپنے نفس کا نگراں رہے اور دوسرے کی حالت کو برے خیال پر محمول نہ کرے۔ کیونکہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی حالت کو نیک محل پر محمول کرے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ قلیل التوفیق مسلمان ہے۔ نووی نے شرح مہذب میں ایسا ہی لکھا ہے اور اگر لوگ اس کی تعظیم و تعریف کریں اور ہاتھ پاؤں چومیں تو سمجھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ابتلا رہے۔ اور ایسے ہی تمام حالات ظاہریہ صالحہ میں بھی خیال کرے اور
اپنے اعمال کو ریاء و نفاق و مخالفت السنتہ سے بچائے رکھے اگرچہ فعل کی
ظاہری صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے مشابہ ہی ہو کیونکہ لوگ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی اقتدار سے قاصر ہیں۔ کیونکہ ان کی
ہر قسم کی عبادت خلل و نقصان سے خالی نہیں ہو سکتی اور ان کے حسنات
(نیکیاں) مقربوں کے سیات (گناہ) کے برابر ہوتے ہیں (حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ
سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ) کے یہی معنی ہیں۔ فضل بن عیاض کہا کرتے تھے کہ جو
شخص کسی ریاکار کو دیکھنا چاہے مجھے دیکھ لے۔ معروف کرخی کہا کرتے تھے
کہ میں چاہتا ہوں کہ بغداد میں نہ مروں۔ کسی نے پوچھا کیوں؟ کہا اس خوف
سے کہ میری قبر مجھے قبول نہ کرے اور میں ذلیل ہوں اور لوگ میرے جیسوں
کے ساتھ بدظن ہو جائیں۔ سیدی شیخ عبدالعزیز درینی سے سفر کی حالت میں
فقراء کی جماعت نے کرامت طلب کی اور وہ اس وقت شہر کے نزدیک
پہنچے ہوئے تھے۔ مگر نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے کہا حضرت ہمیں یہاں سے
شہر دکھلا دو۔ آپ نے کہا سر اٹھاؤ اور دیکھو جب دیکھا کچھ نظر نہ آیا انہوں
نے پھر ضد کی اور دکھلانے کی درخواست کی۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس
سے زیادہ کیا کرامت ہوگی کہ اللہ تعالےٰ نے زمین کو ہمارے لئے پکڑ رکھا
ہے کہ ہم اس پر چلتے ہیں اور ہم کو اس میں ہمارے گناہوں کے باعث خسف
نہیں کر دیا۔ دیکھو یہ حال ہے عارفوں کا۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اعمال شاقہ (قیام اللیل و تحمل اذی
وغیرہ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے اور صرف بال
بڑھانے و صوف پہننے و جبہ و دستار وغیرہ اعمال ظاہریہ خفیفہ کو ہی باعث فخر

نہیں سمجھتا۔ جو شخص اعمال ظاہریہ خفیفہ پر اتراتا ہے اور باطن میں خراب ہے
اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو جمعہ کے دن اپنے بدن اور کپڑوں کو
کتے کے پاخانے سے آلودہ کرے اور پھر ان پر گلاب چھڑکے اور عطر لگائے
اور اگر اسے کوئی کہے کہ ایسی حالت میں عطر و خوشبوئی کو خراب نہ کر۔ اپنے
بدن اور کپڑوں کو صاف کر کہ پہلے یہی ضروری ہے تو وہ جواب دے کہ میں
سنت ادا کرتا ہوں اور بدن اور کپڑوں کی نجاست کی پرواہ نہیں کرتا۔ اب
عقلمند بتلائے کہ اس کام میں کیا فائدہ ہے۔ پس عارف طہارت باطن کو صفائی
ظاہر پر مقدم سمجھتے ہیں اور وہی عارفوں کا طریقہ ہے۔ جب اللہ تعالےٰ جس
کی آنکھیں کھول دیتا ہے اور اس پر امور ظاہریہ کی خباثت منکشف ہو جاتی
ہے تو وہ اپنی ساری عمر اپنے نفس کے علاج میں لگا دیتا ہے فضل بن عیاض
رویا کرتے اور کہتے کہ جو کوئی ریاکار کو دیکھنا چاہے مجھے دیکھ لے۔ دیکھو
بزرگ یہ ہیں۔ کہاں یہ اور کہاں وہ جو ظاہر میں صلاحیت کے زیور سے آراستہ
ہے اور باطن میں نجاست و خباثت سے آلودہ۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ سب
سے ضروری اور اول بات باطن کی صفائی ہے۔ اس کے بعد دنیا کی محبت
و درہم و دینار کی خواہش وغیرہ امور خفیفہ کا ترک کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں رات کو کچھ نہیں ہوتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم خود اپنے ہاتھ سے نمک و گوشت وغیرہ اشیاء خوردنی اٹھا لاتے تھے
اور کسی کو اٹھانے نہیں دیتے تھے اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم اور آپ کے صحابہ کے بیشمار اخلاق تھے جن سے ان کے باطن کی
صفائی کا ثبوت ملتا ہے اور بازار جانے کو ہتک عزت و سبکی خیال نہ کرے
اور بازاریوں کے ساتھ ملنے سے نفرت نہ کرے کیونکہ اس میں رعونت و

نخوت پائی جاتی ہے اور یہ پایا جاتا ہے کہ وہ بازاریوں کو اپنے سے حقیر
سمجھتا ہے حالانکہ وہ اس سے بہتر ہیں اور ان سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہے۔
دیکھو کہ نانوائی و حلوائی و درزی و موچی و بساطی و بقال و دیگر دکاندار کس
گرمجوشی سے خلق خدا کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور اکثر اوقات فارغ
رہتا ہے اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرتا جس کا نفع لوگوں کو پہنچ سکے
اس سے معلوم ہوا کہ فقیر کو ایک حالت میں مقید نہیں ہونا چاہیئے اور دنیاوی
عزت و ناموس کا گرویدہ نہیں ہونا چاہیئے مثلاً یہ کہ کسی وقت میں بڑے عمامے
اور وسیع چوغے کے سوا گزارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر حال میں پھرتا رہے
جو مل جاوے پہن لے۔ جو ہاتھ آجاوے کھا لیوے۔ خود روٹی پکا لے۔ گھر
میں جھاڑو دے لے۔ یتیموں کی خدمت کرے۔ پانی ان کے لئے بھر لاوے
عوام سے ایسی گفتگو کرے کہ گویا انہیں میں سے ہے اور اپنے کو ان سے
ممتاز و اعلیٰ خیال نہ کرے۔ اگر یہ صفات اس میں نہ ہوں تو جاننا چاہیئے کہ وہ
ننگ و ناموس و عزت و حشمت طالب ہے۔ اور لوگوں کا اس سے خدمت
نہ لینا بھی اس امر کی دلیل ہے۔ اگر لوگوں سے کہا جاوے کہ تم شیخ سے خدمت
لیا کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم شیخ سے کیونکر کام لیں اور انہیں جانتے کہ بہ نسبت
غیروں کے شیخ ہی خدمت کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا نفس
شائستہ و مغلوب ہوتا ہے۔ وہ بہ نسبت دوسروں کے خدمت و کام کرنے
کے واسطے جلدی منقاد و مطیع ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان
کا شیخ عزت و وجاہت و ریاست و شوکت کو چاہتا ہے۔ انہوں نے اس
سے خدمت لینی ترک کر دی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شیخ اس کو باطن
میں پسند نہیں کرتا۔ شیخ جلال الدین المحلی عمدۃ المحققین مصری کا یہ حال تھا کہ

بوڑھی عورتیں اور محلے والے ان سے کام لیتے وہ ان کے لئے روٹیاں پکاتے تیل نکالتے اور ہر قسم کی چیز بازار سے لا دیتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے شیخ کا نفس مطیع و منقاد ہے۔ شیخ کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ بہت لوگوں میں بیٹھنے یا بازار وغیرہ میں جانے سے اس کی عزت کم ہوجاوے گی اور لوگ اس سے نفع نہ اٹھاویں گے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار میں چلتے اور لوگوں کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ ان کا کام صرف ابلاغ تھا (مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ) اور اصل ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے (لَوْ شَاءَ اللّٰہُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى) اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی مصلحت عام کے واسطے امر مذکورہ کا خلاف ہوتا تھا تو شیخ کو ان پر اپنے حال کو قیاس نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وساوس نفسانی و خواطر شیطانی سے معصوم ہیں جب کوئی جماعت آپ کے پاس آتی تو آپ بلاشک ان کی صلاحیت کے واسطے اپنے ظاہری لباس کو درست کرتے۔ پانی کے گھڑے میں اپنے عمامے کے پیچ دیکھتے۔ عمدہ لباس پہنتے اور مٹی کے چبوترے پر بیٹھ جاتے تاکہ امتیاز ہوجاوے لیکن یہ تمام امور اہل اسلام کی مصلحت عام کے لئے تھے۔ پس جو شخص اسی قسم کی غرض و نیت صادق سے ایسے کام کرے اس کے واسطے جواز کی صورت ہوسکتی ہے۔ مگر ناقص فقیر ضعیف العقل شیخ کو ایسے کاموں میں بزرگوں کاملوں کی مشابہت سے بچنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے واسطے مدارج و معارف کی بخوبی نہ جاننے اور شیطان و نفس کے ہتھکنڈوں سے پورے طور پر واقف نہ ہونے سے تباہی میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ جیسا کوئی ناقص۔ سیدی علی بن وفاد سیدی شیخ مدین وغیرہ کامل عارفوں کی طرح نفیس لباس و قیمتی پوشاک

پہنے اور کہے کہ میرے لئے بھی جائز ہے کیونکہ فلاں فلاں بزرگ پہنا کرتے تھے اور یہ نہ جانے کہ کہاں رام رام کہاں ٹیں ٹیں کجا ان کا مرتبہ کجا اس کا رتبہ ان سے تو کشف و کرامات کا ظہور صاف بتلاتا ہے کہ ان کا نفس مر چکا ہے اور وہ حظوظ نفسانی و لذات جسمانی کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں کیونکہ خواہشات نفسانی کے ہوتے ہوئے کشف و کرامات کا صادر ہونا محال ہے۔ سیدی شیخ مدین کی کرامتوں سے یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ نے مکان بنوایا۔ ختم ہونے کے بعد مکان کا ایک گوشہ کسی طرف جھک گیا۔ حاکم وقت نے اس کے بنانے والے کو سیاست کا ارادہ کیا۔ یہ حال سن کر شیخ مذکور نے اپنی پیٹھ سے اس گوشے کو اٹھایا اور سیدھا کر دیا۔ نیز ایک دفعہ ان کے کسی مرید کے درہموں کی تھیلی دریا میں گر پڑی اس نے شیخ کے پاس آکر خبر دی۔ شیخ نے مصلے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور وہ تھیلی پانی سے بھیگی ہوئی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے مرید کی لڑکی سے جنگل میں کسی نے بدفعلی کا ارادہ کیا۔ شیخ اس وقت مصر میں بیت الخلا میں تھے۔ وہ لڑکی اس کے مقابلہ سے عاجز آچکی تھی۔ شیخ نے وہاں سے اس بدمعاش کی طرف تیر چلایا وہ اس کی گردن میں لگا اور لڑکی برے کام سے بچ گئی اور وہ تیر لے کر چلی آئی اور اپنے باپ کے پاس لائی۔ اس نے پہچان لیا کہ شیخ کا تیر ہے پھر جب وہ مرید مصر میں شیخ کی زیارت کو آیا تیر اپنے ساتھ لایا اور قصہ سنایا۔ اس کے علاوہ کئی اور کرامتیں اس شیخ کی نسبت مشہور ہیں۔ بس اس قسم کے لوگ جیسا لباس چاہیں پہنیں۔ انہیں ضرر نہیں پہنچاتا۔ مگر ناقصوں کے لئے جن کے اندر ابھی روشنی کی کرن پڑنی شروع ہوئی ہے اور کمزور سی بتی جلنے لگی ہے۔ ان کے اس نور کو خواہشات کی ہوا فوراً بجھا دیتی ہے۔

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ جو شخص یہ دعوے کرے کہ اس قسم کی چیزوں سے اسے نقصان نہیں پہنچتا اور وہ نفس پر قادر ہے اس پر ہم کو اعتراض نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کے کام کو خدا کے حوالے کرنا چاہیئے علاوہ اس کے لباس فاخرہ پہننا حرام نہیں ہے۔ بلکہ ہر حالت میں مباح ہے اور اعتراض اگر ہو سکتا ہے تو محرمات کے مرتکب پر ہو سکتا ہے نہ کہ مباح کے فاعل پر۔ لیکن اس کے دعوے کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ پھٹے پرانے کپڑوں سے ایک غیر معتقد کے پاس جانے سے شرم و عار نہ کرے تاکہ معلوم ہو کہ وہ نفس پر قادر ہے۔ ورنہ ثابت ہوگا کہ نفس کا غلام ہے اور اس کا دعویٰ باطل ہے اور لباس فاخرہ پہننا کسی اور غرض کے واسطے ہے۔ اور کہنہ حالت میں معتقد کے پاس جانا لائق اعتبار نہیں۔ بلکہ اس حالت کے دیکھنے سے اس کا اعتقاد زیادہ ہوگا۔ کیونکہ مرید اس کو ایک خاص حال پر محمول کرے گا۔ لیکن اس شخص کے واسطے جس کی حالت ایسی نہیں جس سے اس کی تعظیم لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ لباس فاخرہ کا کوئی خوف نہیں۔ مگر یہ بلا اس زمانہ کے فقرار میں عام ہے۔ کیونکہ اکثروں کے باطن میں نور نہیں ہے اور لوگوں کا یہ حال ہے کہ اچھے کپڑے والوں کی عزت کرتے ہیں اور دوسرے کی پروا نہیں کرتے۔ وہ اگرچہ اولیار ہو۔ جب فقرار کا یہ حال ہے۔ تو دنیا داروں کا کیا کہنا۔ فافہم وتامل

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی اس کو نیکو کاروں کے رتبہ سے خارج کرے اور ان کو نہ ملنے تو اس سے خفا نہ ہووے۔ کیونکہ اگر وہ خدا کے نزدیک نیک ہے تو مخالف کے انکار اور مخالفت سے اس کی نیکی کو کچھ نقصان نہیں آتا۔ اور اگر نیک نہیں ہے تو وہ سچ کہتا ہے اس کے کہنے

کو کیوں بُرا مانتا ہے۔ پس اس پر کسی وجہ سے خفا ہونا جائز نہیں اور یہ بھی
نہیں چاہیئے کہ منکر کو معتقد بنانے کے لئے اس کے سخت کلام کے مقابلہ میں
شیریں کلامی و نرم زبانی سے سلوک کرے۔ کیونکہ جہاں میں ہزاروں مخالف
و منکر ہوتے ہیں اگر ایک خوش کر لے گا تو دس پھر بھی مخالف و منکر رہی
رہیں گے۔ اسی واسطے اس کی کوشش ہی لاحاصل ہے اور فقیر کو ان
باتوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے اور اس کی نظر میں خدا کے سوا کسی کی محبت
نہیں ہونی چاہیئے اگرچہ اس سے منزل میں تکالیف ہی برداشت کرنی پڑیں۔
جو شخص لوگوں کی تعریف سے خوش ہوتا ہے حالانکہ صلاحیت و تقوے
سے عاری ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کا مرید کہتا پھرتا ہے کہ
میرے شیخ سے پاخانہ کے وقت کستوری جیسی ہوا نکلتی ہے اور وہ اس سے
خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ خود اس کو اس کی بدبو معلوم ہے پس اس سے زیادہ
غرور کیا ہوگا اور وہ کیونکر سالک و عارف کامل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ لوگوں
کی تکلیف برداشت کرنے پر قادر نہیں ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ ادب کی رعایت کرتا ہے۔ اور
آپ کو اضعف ترین خلق اللہ خیال کرتا ہے اور مرید کو یہ نہیں کہتا کہ جب
شیطان تیری خلوت کے وقت ذکر و فکر میں خلل ڈالے تو میرا نام پکار لو اس
سے شیطان بھاگ جائے گا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو
کامل عارفوں سے خیال کرتا ہے۔ نیز جب کہ شیطان خود اس کو پچھاڑ سکتا
ہے۔ تو اس کے نام سے کیونکر بھاگے گا۔ عربی مثل ہے (اِذَا کَانَ الحَلْوٰ ضَرِبَ)[1]

---

[1] جب مٹھائی کوڑے کی چوٹ کھاتی ہے تو کھٹے کا کیا کہنا ہے۔

مَقَابِرِ عِ فَکَیفَ بِالْحَامِضِ) مناسب یہ ہے کہ اگر کچھ مرید سے کہے تو یوں
کہے کہ جب شیطان آوے تو اللہ کا نام یا نبی کا نام یا عمر بن الخطاب کا نام لے
کیونکہ شیطان ان کے سایہ سے بھاگتا تھا۔ اور جب شیطان خدا کے نام
سے نہ بھاگے تو کسی غیر کے نام سے کیونکر بھاگے گا۔ امام احمد بن حنبل کی روایت
ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جن آئے بس
شیطان بھی آیا اور اس کے ہاتھ میں آگ کا شعلہ تھا جس سے رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کا چہرہ جلانا چاہتا تھا۔ پس جبرئیلؑ آئے اور نبی صلعم کو چند
کلمات سکھلائے۔ جن کے پڑھنے سے وہ آگ بجھ گئی۔ بخاری رحمہ اللہ نے
شیطان اور اس کے لشکر کی صفت میں ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ
رسول اللہ صلعم نے نماز پڑھی اور کہا کہ شیطان حاضر ہوا تھا جس سے مجھ پر
نماز کا ختم کرنا مشکل ہو گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس سے نجات دی اور
غلبہ دیا۔ پس شیخ کو ان احادیث میں غور کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی شیخ کہے کہ
میں اپنے نام سے استفادہ اس لئے سکھاتا ہوں کہ مرید دوسرے کے مرتبہ
سے واقف نہیں ہوتا۔ اور جب تک کسی چیز کی حقیقت واقعی و اعتقاد صحیح
معلوم نہ ہو انسان اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ ادب یہ
ہے کہ اپنے سے اعلیٰ کا ادب سکھلا دے۔ کیونکہ مقصود اس سے صرف
مرید کی اصلاح ہے اور کسی کے ہاتھ سے ہدایت ہونا صرف ایک واسطہ
و ذریعہ ہے اور حقیقی فاعل و ہادی اللہ ہے۔ پس اس صورت میں خواہ
کسی واسطہ سے کام چل جاوے برابر ہے تو بہتر یہ ہے کہ مرید کو دوسرے
کا نام سکھلائے تاکہ آپ غرور سے بچے اور اس کا مقصود بھی حاصل ہو جاوے
اب میں شیطان کی طاقت کا حال سناتا ہوں تاکہ خلقت پر اس کا غلبہ معلوم

ہو جاوے سہل بن عبداللہ تستری کا قول ہے کہ میں شیطان سے ملا میں اس کو پہچان گیا اور وہ بھی یہ بات سمجھ گیا۔ ہمارے مابین مباحثہ شروع ہوا ہر طرف سے بڑے بڑے مسائل متعلق پیش ہوئے۔ دونوں طرف سے براہین قاطعہ کی بھرمار ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ میرے علم سے اور میں اس کے علم سے حیران ہو گیا۔ آخر شیطان نے اپنی نجات کے بارے میں آیت (وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ)[1] پڑھی اور کہا کہ یہ آیت عموم پر دلالت کرتی ہے اور بتلاتی ہے کہ ہر شے پر رحمت ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ میں بھی ایک شے ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی بخشا جاؤں گا۔ سہل نے کہا کہ بخدا اس نے ساکت کر دیا اور میں حیران ہو گیا کہ اس کے ذہن میں وہ بات آئی ہے جو میرے ذہن میں گزری پھر میں جواب کے واسطے اس کے مابعد کے آیات دل میں پڑھنے لگا۔ جب اس آیت پر پہنچا۔ (فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ)[2] تو میں خوش ہوا اور خیال کیا کہ اب میں غالب آجاؤں گا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ ملعون خدا نے تو اس رحمت کو صفات خصوصہ سے خاص کر دیا ہے جس سے وہ آیت درجہ عموم سے نکل جاتی ہے اور اس کو وہ آیت سنائی۔ شیطان فرمائشی قہقہہ سے ہنسا اور کہا کہ اے سہل مجھے خیال نہیں تھا کہ تو اس قدر جاہل ہے۔ اے سہل تیرے ہوش کہاں ہیں۔ وہ تقیید جس سے تو اس آیت عام کو خاص کرنا چاہتا ہے تیری صفت ہے نہ خدا کی اور وہ تقیید تیرے متعلق ہے۔ نہ خدا کے۔ سہل نے کہا اب تو میں نہایت شرمندہ ہوا اور نہایت پشیمان ہوا اور اس کی [illegible]

---

[1] میری رحمت ہر ایک چیز کو شامل ہے۔ [2] میں رحمت ان کے لئے لکھوں گا جو پرہیزگاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

کا کوئی جواب نہ بن آیا۔ پھر سہل نے کہا کہ میں نے ارادہ کیا کہ اس سے معرفت کا طریق حاصل کروں۔ اگرچہ خود اس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ کیونکہ کسی سے فائدہ اٹھانے میں کفر و اسلام کا خیال نہیں ہوتا جیسا کسی نے کہا ہے (اُنْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تنظر اِلٰی مَنْ قَالَ) اس مناظرہ کو غور سے ملاحظہ کر کے نتیجہ نکالنا چاہیئے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جب تک مرید کی حالت میں رہے شیخ کے حق میں حتی الامکان نیک اعتقاد رکھے اور ادب کو دل میں جگہ دے اور یہ خیال نہ کرے کہ وہی اس زمانے کے تمام مشائخ سے کامل و افضل ہے۔ کیونکہ اس میں اقطاب و ابدال وغیرہ کاملین اولیاؤں کی بے ادبی ہے اور ممکن ہے کہ اس کا خیال ظن پر مبنی ہو اور ظن جھوٹا ہوتا ہے۔ البتہ فضیلت وہ شخص دے سکتا ہے جس کو الہام الٰہی یا اعلام خدائی سے اس کی افضلیت یقینی معلوم ہو گئی ہو۔ قدوۃ المحققین زبدۃ العارفین شیخ محی الدین کا قول ہے کہ ہر ایک نبی کے قدم پر ایک ولی ہوتا ہے۔ جو اس کا وارث ہوتے ہیں۔ یعنی ہر ایک زمانہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار ولی ہوتے ہیں اور ان کے درمیان علم و معرفت میں وہی نسبت ہوتی ہے جو انبیاء کے درمیان ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح انبیاء ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اسی طرح اولیاؤں میں بھی بعض بعض پر فوقیت رکھتے ہیں۔ کبھی اولیاؤں کی تعداد عدد مذکور سے زیادہ بھی ہو جاتی ہے جب یہ حال ہے تو کوئی مرید اپنے شیخ کو بغیر باقی عارفوں سے ملنے اور ان کا رتبہ معلوم کرنے کے کیونکر سب پر ترجیح دے سکتا ہے امام ابو حنیفہ رح

لہ قول کی صداقت کو دیکھنا چاہیئے نہ کہ قائل کی ذات کو۔

سے کسی نے پوچھا کہ اسود و علقم میں سے کس کو فضیلت ہے۔ آپ نے فرمایا
کہ جب ہم ان کے حالات سے واقف نہیں تو کسی کی نسبت کیا رائے قائم
کر سکتے ہیں دیکھو اس سے معلوم ہوا کہ بغیر علم کامل و شناخت وافر کے کسی کے
حق میں کوئی رائے قائم کرنا حماقت و جہالت ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ شیخی نہیں بگھارتا اور یہ نہیں کہتا کہ
ہمارا درجہ قطب کے رتبہ سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اس میں بے ادبی ہے۔ اور اس
کو کیونکر معلوم ہے حالانکہ وہ کبھی قطب سے نہیں ملا۔ اگر اس کو کشف سے
معلوم ہوا ہو تو اس کے لئے جائز ہے لیکن خلاف ادب ہے۔ اور تقلیداً
اس طرح کا کلام کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً مرید نے اپنے شیخ سے اس طرح
کہتے ہوئے سن لیا اور وہ بھی کہنے لگا۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص اولیاء و اقطاب
و ابدال کے مدارج سے ناواقف ہے۔ وہ تو ایسے کلام میں معذور ہے لیکن
جو شخص اس گروہ کا ہو اور مدارج و مراتب کی کیفیت سے واقف ہو اس کے
لئے اس قسم کا دعویٰ نازیبا ہے۔ کیونکہ پیشہ ور پیشہ ور کو جانتا ہے۔ اور اپنے
اور دوسرے کی حیثیت کو پہچانتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ خود کسی سے سوال نہیں کرتا اور نہ کسی
سائل کو رد کرتا ہے اور نہ ذخیرہ کرتا ہے۔ اصحاب شاذلیہ کا یہی طریقہ ہے
اور ہمارا بھی اسی وقت یہی قاعدہ ہے۔ اور یہی حلال ہے اور اللہ سے دعا
ہے کہ اسی طریقہ میں ترقی کے مدارج تک پہنچا دے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جو اسے شیخ و بزرگ بنا دے
وہ اس کا شاگرد و مرید بنتا ہے اور جو اس کا ہاتھ چومے وہ اس کا پاؤں
چومتا ہے اور وہ دُم کا بال بنتا ہے نہ سر کا۔ (یعنی تواضع کرتا ہے نہ تکبر)

کیونکہ چوٹ سب سے پہلے سر میں لگتی ہے اور لوگوں کے عیوب سے چشم پوشی کرتا ہے کیونکہ لوگوں کے عیوب پر نظر ڈالنے سے اپنے عیوب بڑھتے ہیں اور لوگ حقیر معلوم ہوتے ہیں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا بزرگ شہر میں آجاوے اور اس کے مرید اس کی طرف مائل ہوجاویں اور اس کی بیعت فسخ کردیں تو وہ اس سے رنجیدہ نہ ہو بلکہ خوش ہو اور کہے کہ اچھا ہوا کہ بلا ٹلی اور سردرد گئی اب مزے سے خدا کی عبادت کریں گے اور کوئی چیز مخمل نہ ہوگی اور اگر کبیدہ خاطر ہوجاوے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ طالب شہرت و ریاست ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ جب اس کے سامنے اس کے کسی ہمسر و ہم عصر بزرگ کی تعریف کی جاوے تو رنجیدہ و تنگدل ہوجاوے خصوصاً جب کہ اس کے کسی معتقد کے سامنے دوسرے کا رتبہ بڑھایا جاوے اور اس سے معلوم ہوگا کہ وہ مشیخت و پیری کو ایک پیشہ دکانداری سمجھتا ہے اور یہ خدا کے نزدیک نہایت مذموم امر ہے اور اس حالت میں اس کا کھانا پینا نان و نفقہ پاک حالت میں نہیں ہے اور ایسا شخص مالداروں دولتمندوں کے سامنے خضوع و فروتنی کرتا ہے اور جب اس کے پاس آتے ہیں تو ان کی بہ نسبت فقرا کے زیادہ تعظیم و تکریم کرتا ہے اور ان کا آنا فخر سمجھتا ہے خصوصاً جب کہ عام مجلس و محفل کے وقت آویں۔ اور ان کی جدائی سے ڈرتا ہے۔ اس خیال سے کہ اگر وہ چھوڑ جائیں گے تو ان کی طرف سے گندم و دودھ و شہد وغیرہ اشیاء کی مدد منقطع ہوجائے گی اور جو فقیر روٹی کی خاطر اس کے پاس پڑے ہوئے تھے متفرق ہوجائیں گے اور اس کی عزت و شہرت میں فرق آئے گا۔ پس ایسا شخص اگرچہ دینداری و

حسن سیرت کے زیور سے آراستہ ہو تاہم اس کا کھانا پینا کراہت سے
خالی نہیں ہے اور وہ دنیا کو دین کے بدلے کھاتا ہے اور نہیں سمجھتا اور
خیال کرتا ہے کہ وہ اس آفت سے بچا ہوا ہے۔ فضیل بن عیاض رضؓ کا قول ہے
کہ میرے نزدیک طبل (ڈھول) و مزمار (بانسری وغیرہ) سے کما کر کھانا
دین کے بدلے دنیا کما کر کھانے سے بہتر ہے۔ یہ تو اس شخص کا حال ہے جو
دیندار و صالح ہے۔ لیکن جو بزرگ صلاحیت کے زیور سے عاری ہے۔
اور لوگ صلاحیت و پرہیزگاری کے خیال سے اس کی خدمت کرتے ہیں
تو اس کا کھانا پینا سخت حرام ہے۔ یہ بات سمجھنے کے قابل ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ دنیاداروں سے اپنی حاجت
پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنی بھوک و پیاس کو ظاہر نہیں کرتا۔ کیوں کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھتے
تھے اور ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے اور صحابہؓ صرف چہرے کی زردی سے
پہچان لیتے تھے اور اپنی ضرورتوں کو متمدین اغنیاء کے سامنے کسی تعریض یا
واشارے سے بھی ظاہر نہ کرے۔ مثلاً ان سے یوں نہ پوچھے کہ بازار میں
عمامہ و جبہ و دستار۔ جوتی و چپلی و رومال تہ بند کرتہ وغیرہ کا کیا بھاؤ ہے
تاکہ وہ سمجھ جائیں کہ فقیروں کو ان کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ جانیں کہ یہ
چیزیں اس کے پاس نہیں ہیں تاکہ اس کے واسطے خرید لادیں اور یہ تعریض
گویا تصریح ہے۔ لیکن یہ بات اولیٰ ہے کہ فقراء و غرباء کی مصلحت و فائدہ
کے واسطے تعریض کرنا بہ نسبت اپنے نفس کے بہتر ہے اور اس میں عزت
وصلاحیت ہے۔ اس پر ایک نقل یاد آئی۔ بازاری کتے و شکاری کتے
کا مباحثہ ہوا۔ بازاری کتے نے شکاری کتے کو کہا کہ کیا وجہ ہے کہ میں قانع

ہوں۔ گری پڑی چیز پر گزارہ کرتا ہوں بادشاہوں اور امرار کی صحبت سے کنارہ کش ہوں پھر بھی میری عزت نہیں ہوتی۔ مجھے ہانک دیتے ہیں۔ اور پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ اور تو باوجودیکہ حریص ہے عمدہ عمدہ کھانے کھاتا ہے۔ امرار وزرار کی صحبت میں رہتا ہے۔ تیری تعظیم کرتے ہیں۔ پاس بٹھلاتے ہیں گودیوں میں لٹاتے ہیں۔ شکاری کتے نے جواب دیا کہ تو جو کام کرتا ہے اپنے نفس کے واسطے کرتا ہے اور میں غیروں کے فائدے کے لئے۔ اسی واسطے تو ذلیل کیا جاتا ہے پھٹکارا جاتا ہے اور میری عزت و توقیر ہوتی ہے۔ نیز شیخ کو ان باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے کہ میں غیب سے روزی کھا سکتا ہوں اور ماہیت اشیار کو بدل سکتا ہوں لیکن ادب الٰہی کی خاطر نہیں کرتا۔ کیونکہ ایسی باتوں کا نقصان بہ نسبت نفع کے زیادہ ہے اور قلب ماہیت کرنے والے اولیاؤں کی حکائتیں ذکر کرنا اور پھر یہ کہنا کہ یہ باتیں کاملوں کی شان کے لائق نہیں ہوتیں اس سے آپ کو کامل ظاہر کرنا ہے۔ جو اور کاملوں کے لائق نہیں ہوتیں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ گدڑی پوشوں مفلسوں کی صحبت سے (جن کے کپڑوں میں جوئیں تک پڑی ہوئی ہوں) نفرت نہیں کرتا اور نہ اندھوں وغیرہ بیکسوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اندھے کے حق میں عتاب کیا تھا اور سورہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی نازل ہوئی تھی۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ دوسروں کی شہرت و ناموری پر حسد نہیں کیا کرتا۔ اور یہ نہیں چاہتا کہ میں ہی زمانہ میں ممتاز و سرفراز رہوں اور کوئی دوسرا میرا ہمسر نہ ہو کیونکہ ایسا کرنے والا شیطان کا بھائی ہے

بلکہ شیطان سے معرفت میں کم ۔کیونکہ شیطان معرفت میں کامل ہے اگرچہ اس راستے پر نہیں چلا ۔

میں ناظرین کو شیطان کی کہانی سناتا ہوں ۔میں ایک دفعہ عالم خواب میں شیطان سے ملا ۔ اور باہم مذاکرہ شروع ہوا ۔ ابلیس نے کہا کہ تمام اقسام کے طاعت و معاصی اللہ کے کمالات ہیں ۔کیونکہ اللہ کے اسمار متضادہ اپنے اپنے محل ظہور کے متقاضی ہیں ۔ مثلاً اسم منتقم (انتقام و بدلہ لینے والا) ایسے وجود کا متقاضی ہے جس سے انتقام لیا جاوے اور ایسے وجود گناہگاروں کے ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے منتقم کی اس صفت سے موصوف ہونے کے لئے گناہگاروں کا ہونا لازم ہے ۔ایسا ہی اسم رحیم ایسے وجود کو چاہتا ہے جس پر رحمت کی جاوے تاکہ خدا کی صفت رحمیت کا محل بنے اور یہ وجود فرمانبرداروں کا ہے ۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رحیم وغیرہ اوصاف جمالیہ سے موصوف ہونے کے واسطے نیکوکاروں کا ہونا بھی ضروری ہے ۔پس کوئی وجود طاعت و معصیت سے خالی نہیں تاکہ وہ اپنے اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ کی صفات جمالیہ وجلالیہ کے ظہور کا محل ہو سکے ۔کیونکہ اللہ تعالےٰ کا ہر ایک اسم اپنے محل وقوع کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اوامر ونواہی کا خطاب ہر مومن وکافر وتابع وعاصی وغیرہ ارواح کو شامل ہے اور حقیقت میں ہر چیز اس کے امر کے تابع ہے اور نہی کا اطلاق اس اعتبار سے ہوتا ہے جب انسان انکار کو اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے اور ہر وقت زمانہ میں ہر شخص پر اسماء الٰہی کا ظہور ہوتا رہتا ہے ۔ مثلاً جب کوئی شخص صفت انتقام کا محل ہوتا ہے ۔جب وہ مدت گزر جاتی ہے تو اس پر رحمت و

لطف کے احکام جاری ہوتے ہیں اور اسم رحیم کا مورد ہو جاتا ہے۔
گویا تمام مخلوق اس کے ارادہ کو پورا کر رہی ہے اور اس کی منشار کا محل
بنی ہوئی ہے اور تمام امر کے ساتھ مخاطب ہیں پس جو امر کو تسلیم کر لیتا ہے
مطیع کہلاتا ہے اور جو انکار کرتا ہے عاصی و شقی پکارا جاتا ہے۔ لیکن
حقیقت میں یہ بھی اس کے ارادہ کو پورا کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ اسم قہار کا محل
ہو کر اس کی صفات کو ظاہر کر رہا ہے۔ ورنہ انسان ضعیف البیان کی کیا
ہستی ہے کہ اس کے امر سے سر پھیرے اور اپنے ارادہ کو اس کے ارادے
پر غالب کر لے۔ پس انسان ہر وقت اسمار الٰہی کے ہاتھ میں اسیر ہے۔ ایک
اسم کو چھوڑتا ہے تو دوسرے کو قبول کرتا ہے۔ اگر ایک صفت کے مورد
ہونے سے نکلتا ہے تو دوسری صفت کا محل ہو جاتا ہے۔ اور انسان کا
انکار و مخالفت کی حالت میں معاتب و مواخذ ہونا اس فعل کو اپنی طرف
منسوب کرنے اور اسم الٰہی کی طرف مضاف نہ کرنے کی وجہ سے ہے
یہاں تک ابلیس کے کلام کا مضمون ہے۔ دیکھو یہ لعین اسمار الٰہی کے مفہوم
سے کیسا واقف ہے اور کیسا بڑا عارف ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اپنے (ہمعصر) کے حق میں مذمت
سے زبان نہیں کھولتا نہ تصریحاً نہ تعریضاً۔ کیونکہ تعریض بھی تصریح کے حکم
میں ہوتی ہے۔ لیکن اس عادت کی مشق کم فقرا سے پائی جاتی ہے۔ ورنہ اس
سے بچنا بہت مشکل ہے البتہ مدعیون (جھوٹے دعویداروں) کے بعض نتیجے
ظاہر کر دینے میں چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ نیت یہ ہو کہ لوگ ان
کی تابعداری سے بچیں اور ان کے دام تزویر میں نہ پھنسیں۔ جیسا کہ آج کل
اکثر قاصروں کا حال ہے اور جو صرف جبہ و دستار و ٹوپی مندوں کے شیخ

ہوتے ہیں نہ کسی کمال وفضل وکشف وکرامت کے لیکن مذمت کے دروازے کو عام طور پر کبھی نہیں کھولنا چاہیئے اور اس فعل کو نصیحت وخیرخواہی کی آڑ میں اپنے ہمسروں کی ہتک عزت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے اور اپنے ہمعصروں کے حق میں یوں نہ کہنا چاہیئے کہ فلانے سے کوئی تجلی وتعلی واقع نہیں ہوئی۔ حالانکہ قوم (صوفیہ) کے نزدیک سلوک ومعرفت کی یہی علامت ہے اور اس نے اس طریق کا ذائقہ نہیں چکھا اور اگر اس نے کچھ چکھا ہوتا تو البتہ ہم کو اس کی مذمت وحقارت کی توفیق نہ دیتا وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ غیبت ہے اور غیبت حرام ہے۔ علاوہ اس کے یہ وساوس نفسانی ہیں۔ اسی واسطے ایسے دو فقیروں کا ملنا مشکل ہے۔ جن کے درمیان صفائی وہمت واتفاق ویگانگت ہو بلکہ برخلاف اس کے ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کسی ولیمہ یا عرس وغیرہ موقع پر بلایا جاوے اور اس کو معلوم ہو جاوے کہ کوئی دوسرا اس کا بھائی (فقیر) بھی وہاں موجود ہے تو وہ اسے منظور نہیں کرتا کیونکہ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ واقع میں ایسے لوگ بہائم سے بدتر ہیں اور لوگ ان کی شامت اعمال سے مصیبت وبلائیں ہیں اور انہیں لوگوں کے وجود سے قحط ووبا نازل ہوتی ہیں اور اگر دنیا میں بہائم ودیگر بے زبان حیوان نہ ہوتے۔ جن کے خاطر اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت برساتا ہے۔ تو انسانوں پر بارش نہ ہوتی اور بھلے وبرے سب ہلاک ہو جاتے۔ یہ اس حدیث کا مضمون ہے۔ جو حضرت عائشہؓ صدیقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی تھی اور عائشہؓ نے پوچھا تھا کہ کیا کہ ہم ہلاک ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ ہم میں نیکوکار بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ہاں عائشہؓ جب خباثت کثرت سے

پھیلتی ہے۔ تو نیکو کار و بدکار ہر دو عذاب کے شکنجہ میں کھینچے جاتے ہیں۔
پس ایسے مدعیون لوگوں کے ساتھ استسقا وغیرہ اوقات حاجت دعا میں
باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ کیونکہ اکثر ان کی وجہ سے اجابت نہیں ہوتی کیونکہ
ان کے باطن دعویٰ سے بھرے ہوتے ہیں اور وہ آپ کو مقرب بارگاہ الٰہی
سمجھتے ہیں اور دعا کے لئے لوگوں کے آگے کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے کو
لوگوں سے بڑا خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے سبب سے لوگوں پر
بارش ہوتی ہے۔ اور یہ تمام خیالات خلاف ادب و عبودیت ہیں ان سے
تو منکر و ملحد اچھے ہیں اور ان کے دل تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔
دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جب اس کو اپنے شیخ یا کسی دیگر
کامل سے تلقین کی اجازت مل جاوے تو اپنے آپ کو بھائیوں و مریدوں
و شاگردوں کی نصیحت سے بے پرواہ نہ سمجھے بلکہ ان کو صراحتاً اجازت
دے کہ اگر کوئی عیب مجھ میں دیکھیں تو مجھے نصیحت کریں اور اس سے منع
کریں خصوصاً ایسی حالت میں تو یہ کام بہت ہی ضروری ہے۔ جب کہ معتقدین
کے دل میں اس کی بہت عزت و تعظیم ہو اور اس کے آگے سرنگوں بیٹھے
ہوں اور نہایت ادب و تعظیم بجالاتے ہوں۔ عمر بن الخطابؓ نے ایک
دفعہ اپنے اصحاب کی آزمائش کا ارادہ کیا اور کہا کہ اگر میں حق کے طریق
سے منحرف ہو جاؤں تو تم میرے ساتھ کیا کرو گے انہوں نے کہا کہ ہم تیرے
سر کو تلوار سے اڑا دیں گے۔ حضرت عمرؓ خوش ہوئے اور کہا کہ ایسا ہی ہونا
چاہیئے۔ پس جو شیخ قاصر ایسا نہ ہو اور اس سے ایسے افعال صادر ہوتے ہوں
جو ظاہراً خلاف شرع ہوں تو اس کو اپنے مریدوں سے یہ کہنا جائز نہیں ہے
کہ اس کے افعال خلاف شرع کو تاویل سے شرع کے مطابق کر لیا کریں بال

البتہ اگر کاملوں سے ایسے افعال صادر ہوں اور وہ لوگوں کو ان کی تطبیق
دتاویل کے لئے حکم دیں تو جائز ہے کیونکہ ان کے نفوس وساوس شیطانی
وخواطر نفسانی سے پاک ہوتے ہیں اور وہ اپنے طرف سے سیدھے راستے
پر ہوتے ہیں اور ان کی قوت ضمیر (کانشنس) ہر حال میں تربیت یافتہ
ہوتی ہے اور ان کا حکم دینا مریدوں کی مصلحت کے واسطے ہوتا ہے۔
لیکن جس کا ایسا حال نہ ہو وہ کیونکر اپنے مریدوں کو کہہ سکتا ہے کہ اس کے
سارے افعال کو شرع پر محمول کیا کرو۔ حالانکہ اس کا نفس ابھی کدورتوں
سے صاف نہیں ہوا۔ پس کہاں یہ اور کہاں وہ۔ عارف حضرت امیرالمومنین
عمر بن الخطابؓ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو میرے پاس
میرے عیوب کا تحفہ لادے اور حذیفہ بن یمان کے گھر جاتے اور کہتے کہ
اے حذیفہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر وقت ندیم تھا۔ اور
منافقوں کو پہچانتا تھا۔ مجھے تو دیکھ اور بتلا کہ مجھ میں کتنا نفاق ہے۔ حذیفہؓ
فرماتے یا امیرالمومنین بخدا آپ میں کوئی نفاق کی علامت نہیں ہے حضرتؓ
فرماتے کہ اچھی طرح دیکھ۔ پس حذیفہؓ رو پڑتے اور حضرت عمرؓ بھی رونے
لگتے اور دونوں روتے رہتے یہاں تک کہ ہر دو بیہوش ہو جاتے۔ حذیفہؓ
تو حضرت عمرؓ کی بے نفس کلام سننے سے روتے اور حضرت عمرؓ نا معلوم نفاق
کے خوف سے روتے۔ دیکھو کمال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے نفس کو نفاق سے
متہم کرتے ہیں باوجودیکہ (لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ الخ) سے ان کے
جنتی ہونے کی شہادت اور خدا کی رضامندی کی خوشخبری مل چکی ہے اور
وہ بلاشک بیعت الرضوان والوں سے ہیں۔ پس جب حضرت عمرؓ کا یہ حال
ہے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالےٰ اپنا فضل وکرم کرے اور دوزخ کے

عذاب سے بچاوے۔ سیدی قطب ربانی احمد عارف کا قول ہے کہ جو شخص ہمیشہ اپنے نفس کو متہم نہیں کرتا وہ کاملوں کے دفتر میں نہیں لکھا جاتا۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا نام بغیر ملانے لفظ سیدی یا شیخی کے پکارے تو وہ برا نہیں مانتا۔ کیونکہ یہ صحیح کلام ہے بخلاف اس حالت کے کہ اگر وہ خدا کے نزدیک شیخ یا سید نہ ہوا اور لفظ شیخ یا سید سے پکارا جاوے تو پکارنے والا جھوٹ میں پڑے گا۔ پس شیخ کو چاہیئے کہ جو شخص اس کے سادہ نام کو پکارے اس کو گستاخی و بے ادبی پر محمول نہ کرے۔ لیکن شاگردوں کو شیخ کا نام لے کر نہیں پکارنا چاہیئے کیونکہ وہ ادب کے واسطے مامور ہیں پس ان کو چاہیئے کہ شیخ کے نام کے ساتھ لفظ یا شیخ یا سیدی مولانا وغیرہ لگا کر پکاریں۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر اسے رونا نہ آوے یا خوف و خشیت ناقصوں کا کام ہے۔ کامل ایسی چیزوں سے متاثر نہیں ہوتے کاملوں کو ایسے کاموں سے کیا واسطہ اور اپنی تائید میں ابوبکر صدیق رض کے اس قول کو (جو انہوں نے ایک شخص کو قرآن سننے سے روتا دیکھ کر کہا تھا کہ ہم بھی ایسے تھے یہاں تک کہ ہمارے دل سخت ہو گئے) پیش نہیں کرتا اور یہ بھی نہیں کہتا کہ ایک دفعہ لوگوں میں سماع کے سننے سے حرکت پیدا ہوئی اور حضرت جنیدؒ وجد میں نہ آئے لوگوں نے اعتراض کیا تو آپ نے کہا (تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ)[1] یعنی ہم پہاڑ ہیں تم لوگ ہماری حرکت کو محسوس نہیں کر سکتے۔ وغیرہ وغیرہ حکایتیں بالکل

---

[1] تم پہاڑوں کو جمے ہوئے خیال کرتے ہو حالانکہ وہ بادلوں کی طرح دوڑ رہے ہیں۔

بیان نہیں کرتا کیونکہ اول تو وہ اُن کے درجہ کا نہیں ہے جن کی وہ حکایات پیش کرتا ہے۔ دیگر بتقدیر تسلیم کیا وہ ہر حال میں ان کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن اصلیت تو یہ ہے کہ عارفوں پر ہمیشہ رونا و خوف غالب رہا ہے یہانتک کہ ابو بکر صدیقؓ کہا کرتے تھے کہ کاش کہ میں پرند ہوتا یا گھاس کا تنکا ہوتا۔ اور حضرت عمرؓ کا قول تھا کہ کاش کہ مجھے ماں نہ جنتی۔ حضرت عائشہؓ کا مقولہ تھا کہ کاش کہ میں کچھ نہ ہوتی۔ فضل بن عباسؓ کا قول ہے کہ مجھے نہ کسی رسول پر رشک آتا ہے نہ کسی ملک مقرب پر نہ کسی نبی و ولی پر مجھے تو اُن پر رشک آتا ہے جو پیدا نہیں ہوئے۔ یعنی میں افسوس کرتا ہوں کہ میں پیدا ہی کیوں کیا گیا۔ سید عمر بن عبد العزیز کا ذکر ہے کہ ایک شخص کو اُن کے محل کے نیچے رات کاٹنے کا اتفاق ہوا۔ اس پر پانی گرا۔ حالانکہ آسمان بالکل صاف تھا وہ حیران ہوا اور سبب دریافت کرنے کے واسطے چوبارے پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ عمر بن عبد العزیز سجدہ میں سر رکھے ہوئے رو رہے ہیں آنسو میزاب سے بہہ رہے ہیں۔ اب اس بھلے مانس سے پوچھنا چاہیئے کہ کیا وہ ناقص تھا اور تو کامل ہے۔ پس انسان کو سمجھنا چاہیئے اور ادب اختیار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ادب میں ہی بڑی برکت ہے۔ اور گزشتہ اولیاؤں کو ان کے کلام میں تلوین (ایک حالت پر رہنا بلکہ ہر ایک درجہ میں رنگ بدلنا) ہونے سے بُرا نہیں ماننا چاہیئے کیونکہ جو انہوں نے کرنا تھا کر چکے اُن کے اعمال ان کے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ تو پھر کسی کو بُرا کہنے سے کیا فائدہ۔ علاوہ اس کے جو شخص مثلاً یہ کہتا ہے کہ شیخ عمر بن الفارض و شیخ محی الدین وغیرہ ارباب تلوین ہیں۔ اس نے ابھی تلوین کا مزہ بھی نہیں چکھا ہے جا ئیکہ درجہ تمکین تک پہنچے۔ یہ شخص جو ایسا کہتا ہے وہ غالب

تقلید سے کہتا ہے اور یہ تقریر رسالہ قشیری وغیرہ فقہائے صوفیہ کے رسالوں
کی بنا پر ہوتی ہے اور لطف یہ کہ ایسا مقلد اُن کی مراد نہیں سمجھتا۔ کیونکہ تلوین
کو بُرا ماننے والوں کی مراد وہ تلوین ہوتی ہے جو بلا تمکین ہو۔ کیونکہ اُن کے
نزدیک کامل وہی ہے جو تلوین میں تمکین (پورا استقلال) رکھتا ہو۔ اگر یہ مراد
نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے حق میں (كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ) موزوں نہ ہوتا۔ پس
کامل وہی ہے جو ہر لحظہ پلٹے کھاتا ہے اور ہر سانس کے تغیر و تبدل کو جانتا
ہے اور ہر لحظہ ترقی کے زینے پر چڑھتا ہے اور ہر نفس کا حساب لیتا ہے اور
جو شخص نہیں جانتا کہ ہر لحظہ اُس کے اندر کیا کیا آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ وہ
خدا کی معرفت سے ناواقف ہے اور اپنے نفس اور جہان کی حقیقت سے
جاہل ہے۔ پس تجھے اولیاؤں کے حالات پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے کہ تیرا
اعتراض تیری حماقت و عدمِ واقفیت کی دلیل ہوگا۔ اور اس پر کوئی ثمرہ
مرتب نہیں ہوگا کیونکہ جو عالمِ آخرت میں چلے گئے ہیں تو اُن سے مواخذہ
نہیں کر سکتا۔ نیز اس کلام سے کہ فلاں ناقص تھا۔ تجھے کیا فائدہ ہے۔ اس
تقریرِ مزبور سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ خدا کی بارگاہ میں گریہ و زاری نہ کرنا نقصانِ
مرتبہ و قساوتِ قلب کی علامت ہے۔

سلف سے جو اس کے برخلاف منقول ہے کہ وہ نہیں رویا کرتے
تھے۔ یہ کسی نادر وقت میں ہوتا تھا اور نادر پر حکم نہیں ہوتا۔ لیکن کمزور نہ
ناقصوں کا قاعدہ ہے کہ جب اپنے سے کچھ ہو نہیں سکتا تو اپنے مناسب
حال حکایتوں سے استدلال کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ بات کسی کامل سے ساری
عمر میں ایک ہی دفعہ ہوئی ہو۔ مگر وہ ناقص اپنے مطلب برآری کے واسطے
کے واسطے [illegible] اور اکثر [illegible] کو جو اُسے

مخالف پڑتے ہیں چھوڑ دیتا ہے - دیگر اس کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے
اعمال صالحہ پر بھی اعتماد نہیں کرتا تو پھر ایسے اعمال کا جن میں نفس کی مداخلت
بھی ہو کیا کہنا ہے - میں نے ایک یہودی کو سُنا کہ وہ دوسرے سے کہہ رہا تھا
کہ اپنے نفس کو ہرگز نیک خیال نہ کرنا اور اس کے ہتھکنڈوں سے غافل نہ ہونا
اور اعمال کو نفس کی مداخلت سے بچانا کہ ایسے اعمال بارگاہ خداوندی میں
مقبول نہیں ہوتے - پس جب یہود کا یہ حال ہے تو ہم مسلمانوں کو اپنے حال
پر رونا چاہیئے اور اپنی حالت کا ملاحظہ کرنا چاہیئے - افسوس کہ اس زمانے
میں مشائخ کا ایک دوسرے کو نصیحت کرنے کا دروازہ بند ہو گیا ہے
کوئی کسی کو نصیحت نہیں کرتا اگرچہ ایک کو دوسرے کے عیوب معلوم بھی
ہوں - قادرین کو یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر کوئی ان کو نصیحت کرے گا اور
ان کے عیوب کا اظہار کرے گا تو اس کے معتقد خیال کریں گے کہ یہ ناقص
ہے - ورنہ دوسرا اُس کو کیوں نصیحت کرتا - اور اس کے عیوب کیوں ظاہر
کرتا - حالانکہ سلف صالحین کے درمیان نصیحت وخیر خواہی و اظہار سہو
و خطا و بیان عیب و گناہ کا دروازہ کھلا تھا - اگر کسی سے کوئی خطا و متابعت
ہوا سرزد ہوتی تھی تو اس کو توبیخ و سرزنش کرتے تھے اور وہ اُس سے خوش
ہوتا تھا - جب یہ معلوم ہوا تو تجھ کو چاہیئے کہ کسی کی نصیحت و خیر خواہی و اظہار
عیب و بدراہی کو بُرا نہ مانے اگر اُس سے تیرے معتقدین کے دل میں تیری
عزت نہ رہے اور خلقت تیری مذمت کرے - بلکہ تجھے اپنے دل میں
ٹھان لینا چاہیئے کہ تو حقیقت میں فقیر نہیں ہے مگر عوام کے نزدیک - اور
تو کامل فقراء کے درجے میں نہیں ہے نیک آدمی وہ ہے جو لوگوں میں
مستور ہے اور شیخت و بزرگی کی لاف نہ مار - کیونکہ فقر نور ہے - جب تک

فقیر اُسے چھپائے رکھے - یاد رہے کہ جب تجھے کسی ناقص و قاصر کی ملاقات کا اتفاق پڑے تو اُس کے سامنے کسی خواب و القاء و کشف و کرامت کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اُس پر اپنی فضیلت ظاہر کرنی چاہیئے کہ اس سے اس کی طبیعت مکدر ہو جائے گی - بلکہ اس سے دعا کی درخواست کرنی چاہیئے اور متعلموں کی سی ہیئت بنا کر اس سے نصیحت و اظہار عیوب کا طالب ہونا چاہیئے - تجھ سے کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جس سے وہ معلوم کرے کہ تو مشیخت و بزرگی کا طالب ہے - کیونکہ اسی وقت اس کا نفس سر اٹھائے گا اور تیرے کلام سے فائدہ نہیں پائے گا -

یہ بھی یاد رکھ کہ اگر کوئی تجھے نصیحت کرے تو تو اس کے حق میں یوں نہ کہیو کہ واہ سبحان اللہ دیکھیئے فلانا ہمیں نصیحت کرتا ہے - مگر کیا کرے بیچارہ معذور ہے - وہ خیال کرتا ہے کہ فقراء کو بھی ایسی نصیحتوں کی ضرورت ہوتی ہے حالانکہ نہیں جانتا کہ فقراء کدورات بشریہ سے صاف ہوتے ہیں اور ایسی نصیحتوں کی ضرورت فقط اراذل عوام کو ہوتی ہے نہ فقراء کو جن سے شیطان کا لشکر بھی بھاگ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ - کیونکہ اس سے لوگوں کو یہ جتلانا ہے کہ تو عیوب و گناہوں سے پاک ہے اور اپنے آپ کو فقراء کاملین کے زمرہ سے شمار کرتا ہے نیز اس کی نصیحت سے تیرا نفس برانگیختہ نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ تو اُس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ مارے اور ناقصوں کے کلام کو اپنی تائید کے لئے آڑ بنا دے - کیونکہ اس میں نفس کی اعانت ہے - اور اُس کا وبال و نقصان تیری طرف عائد ہو گا - نیز جب کوئی تیرا ہمسر تجھے نصیحت کرے تو اس کے حق میں یہ نہ کہو کہ وہ غیرت و رشک سے نصیحت کرتا ہے - اور چاہتا ہے کہ لوگ اس پر کیوں جمع ہوتے ہیں اور چاہتا ہے کہ لوگ میرے پاس آویں اور مجھ سے استفادہ کریں وغیرہ وغیرہ - یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے

کہ یہ کام میرے اختیار میں ہے اگرچہ حق ہی ہو۔ کیونکہ اس شکل میں یہ حق بھی
باطل ہوتا ہے۔ نیز ایسی باتوں سے بھی پرہیز کرے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی
بندے کو لوگوں کی مصلحت کے واسطے مقرر کرتا ہے تو چارو ناچار اس کی
محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے کیونکہ نفس ایسی باتوں سے خوش
ہوگا۔ جو اس کے حق میں سم قاتل ہے علاوہ اس کے ایسی باتوں سے پایا جاتا
ہے کہ تو اپنے نفس کو عیبوں سے پاک سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو ان لوگوں
کے گروہ سے خیال کرتا ہے جو خلقت کی صلاحیت و بندوں کے ارشاد
و ہدایت کے واسطے مبعوث ہوتے ہیں گویا تو رسول اللہؐ کا نائب ہے۔
لیکن غور و فکر کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تیرے وجود سے تو باورچیوں گرما
گرم چنے بیچنے والوں۔ تیل فروشوں۔ زمینداروں وغیرہ دوکانداروں کا وجود
زیادہ مفید ہے اور اس میں اندھا بھی شک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسانی
ضروریات اور اس کی زندگی تمام قسم کی دستکاریوں اور حرفتوں سے وابستہ
ہے۔ نانبائی و روٹی مہیا کرنے والی کی قدر بھوکا جانتا ہے اور موچی کی
قیمت ننگے پاؤں والا پہچانتا ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اصحاب
پیشہ بہت نیک ہیں اور ان کا نفع عام ہے۔ باوجود اس کے وہ اپنے
آپ کو حقیر سمجھتے ہیں اور عالموں و فقیہوں کے جور و جفا کو برداشت کرتے
ہیں اور ان کی سب و شتم (مثلاً اے جاہلو اے گدھو وغیرہ) کے متحمل
ہوتے ہیں بلکہ ان سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ شیخ کو مریدوں
کی کثرت سے شیخی نہیں بگھارنی چاہیئے اور اس کو ذریعہ بزرگی و پارسائی
نہیں جاننا چاہیئے۔ کیونکہ اگر کثرت معتقدین سے کوئی شیخ ہو جاتا ہے۔ تو
اشعث اغبر (جن کے بال بکھرے ہوئے ہوں کپڑے میلے کچیلے پاگل دیوانے)

زیادہ مشیخت و بزرگی کے لائق ہیں کیونکہ ایسے لوگوں پر لوگ کثرت سے جمع رہتے ہیں اور ہر ایک وقت اُن پر لوگوں کا اتنا جھمگھٹا ہوتا ہے کہ کسی شیخ کے حلقہ میں اتنی مقدار کا ہونا معلوم - خبردار اس خیال کو دل سے دور کر دے کہ تو لوگوں کا ہادی ہے اور لوگ تیرے ہاتھ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اگرچہ ہدایت کے واسطے واسطہ شرط ہے۔ لیکن اس قسم کا خیال غرور کا باعث و ہلاکت کا موجب ہوتا ہے اور ایسے خیال سے عقل و رشد کو نقصان پہنچتا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ لباس مشیخت اور ہیئت بزرگی وجبہ و دستار و ضیافتوں کی بھرمار سے مغرور نہیں ہوتا اور تلامذہ و معتقدین کی کثرت اور ارادت سے اپنے آپ کو بہت نیک خیال نہیں کرتا اور ایسے لوگوں کی طرح نہیں ہوتا کہ جب اُن کے متبعین بڑھ جاتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور شکر بجا لاتے ہیں اور جب وہ کم ہو جاتے ہیں تو منقبض ہو جاتے ہیں اور غمناک ہوتے ہیں اور باطن میں اللہ پر خفا ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ اُن امور کی طرف کسی حیثیت سے متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ فقر کا کام یہ ہے کہ وہ انواع و اقسام کی عبادات و قربات سے ظاہر و باطن میں خدا کی طرف متوجہ رہے اسی واسطے اہل اللہ اپنی مجالس میں اپنے ہم صحبتوں کے ظاہری حالات پر متوجہ نہیں ہوتے اور اُن کے عمامول و میلے کپڑوں و مصلوں کی اصلاح نہیں کرتے بلکہ اُن کی ساری توجہ اُن کے اصلاح قلوب میں لگی رہتی ہے۔ اور امور ظاہریہ سے بالکل غافل ہوتے ہیں اور ہر وقت یاد خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن اپنے اہل و عیال و اطفال کے حقوق میں مصروف رہنا غفلت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر اُن کے حقوق مقرر کئے ہیں اور حق کا بجا لانا فرض ہے۔ حدیث (لی وقت لا یعنی فیہ غیر ربی) میں اُسی مضمون مذکور

کی طرف اشارہ ہے اور واقع میں یہ ایسا مقام ہے جہاں نہ اپنے نفس کا ہوش رہتا ہے نہ غیروں کی خبر ہوتی ہے۔ اگر تامل کیا جائے تو آیت ذیل (یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا) سے اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا سے بے تعلق و امور ظاہر سے غافل اور ان سب بچنے والے ہی خدا کی طرف جائیں گے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے شفقت و مہربانی سے پیش آتا ہے اور ان کی دل آزاری و رنجیدگی کا باعث نہیں ہوتا ہے اور اگر کسی دعوت وضیافت میں جاتا ہے تو صاحب دعوت کی اجازت وطلب صادق اور رغبت کامل کے بغیر اپنے شاگردوں کو اس میں شامل نہیں کرتا۔ کیونکہ شاگردوں کے حق میں لوگوں کی میل کچیل (صدقہ و خیرات) کا برداشت کرنا نقصان دہ ہے۔ سیدی شیخ ابراہیم جب کسی دعوت پر جاتے اور مرید بھی ان کے ساتھ جانے کا ارادہ کرتے تو آپ فرماتے کہ اگر تم میرے فرمانبردار ہو تو واپس چلے جاؤ اور زہر نہ کھاؤ۔ میں تو زہر کھانے جاتا ہوں۔ کیا تم بھی زہر کھانا چاہتے ہو۔ میں دریا ہوں مجھ میں زہر اثر نہیں کرتا اور مریدوں کی یہ حالت نہیں ہوتی کہ وہ نفس امارہ کی قید سے آزاد ہوں بلکہ اگر انہیں لے جایا جائے تو آپس میں کہتے ہیں کہ یارو زندگی کا لطف تو یہی ہے کہ شیخ کی خدمت میں بسر ہوتی ہے۔ اور جو حاضر نہ ہو اسے عتاب کرتے ہیں اور اس کی حرفت وصنعت کو (جس سے وہ اپنی اور اپنے عیال و

لہ (حاشیہ برصفحہ ۱۵۰) ایک وقت مجھ پر ایسا آتا ہے جس میں خدا کے سوا کسی کی گنجائش نہیں ہوتی یعنی کمال محویت ہوتی ہے۔ لہ متقیوں کو ہی خدا کی طرف جانا نصیب ہوتا ہے یعنی کامل محوی والے ہی لذت دیدار اٹھائیں گے۔

اطفال کی مدد کرنا ہے) حقیر و معیوب سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے شیخ ضیافت کے لئے کوئی نہ بلائے اور صدقہ و خیرات نہ کرے اور وہ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتا ہو اور جَو و جوار کی روٹی کھاتا ہو اور اُن کو بھی ساتھ خشک نمکین روٹی کھانی پڑے اور ننگے پاؤں رہنا پڑے تو ان ایام کو متبرک و غنیمت نہیں سمجھتے اور اس حالت میں شیخ کے ساتھ پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اس کا مصیبت کا سلسلہ و قیامت کا مقابلہ خیال کرتے ہیں اور ایسی حالت میں شیخ کو چھوڑ جاتے ہیں اور اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ پس اس سے نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ مریدوں کے دل کی حالت کیا ہوگی۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں (مشائخ) کے عیوب کو چھپاتا ہے اور ان کی خوبیوں و نیکیوں کو ظاہر کرتا ہے اور اُن کی تعریف کرتا ہے اور بلا خیال مکافات اُن کے ذکر خیر کو پھیلاتا ہے۔ کیونکہ کسی کی تعریف کے بدلے تعریف کرنا اور معاوضۂ مکافات میں اپنے بھائی کا ذکر خیر کرنا اور اس خیال سے کسی کی تعریف کہ اُس کے دل میں اس کا حسن خلق مرکوز ہو جائے۔ اور اُس کے حق میں نیک اعتقاد رکھے۔ بزرگی و علو ہمتی کی بات نہیں ہے۔ علو ہمتی و فراخدلی تو یہ ہے کہ کسی کی خوبیوں کا اظہار بلا غرض و غایت کیا جائے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ غیبت میں جہاں تک ہو سکے اپنے ناقص ہمعصروں کے حالات کی تاویل کر کے اُن کے عیوب کو خوبیوں کا لباس پہنا دے اور جب حاضر ہوں تو اُن کے عیوب کی اُن کے سامنے تشریح کر دے اور اس کی پروا نہ کرے کہ اس کی نصیحت و خیر خواہی سے متغیر ہو جائینگے کیونکہ اس صورت میں اُن کے عیوب کا اظہار اُن کے حق میں مفید ہے۔ اگرچہ

وہ نہ سمجھیں۔ کم از کم یہ تو ہوگا کہ نصیحت کے زمانے تک تو اپنے نفوس کو حقیر و معیوب خیال کریں گے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر اس سے کوئی دعویٰ ہو گیا ہے اور مریدوں کی تصدیق و اعتقاد سے اُس کا دل خوش ہو چکا ہے تو پھر ایسی باتیں نہیں بناتا جس سے سامعین کو وہم گزرے کہ وہ اس دعوی سے خوش نہیں ہیں۔ اور ایسی باتیں اُس کو تسکین و طمانیت کے مقام سے نہیں ہلاتیں۔

نیز کسی کی حقارت نہیں کرتا کیونکہ حقارت سے اس کے اصحاب و احباب کے دل میں اس کی بے وقعتی و رسوائی بیٹھ جاتی ہے اور وہ اس کو ممقوت خیال کرتے ہیں کیونکہ (الارواح جنود مجندہ) میں یعنی محبوب کو محبوب خیال کرتے ہیں اور ممقوت کو ممقوت و مبغوض۔ اور ہر خیال کے اثر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ جو شخص تجھے بدکاروں کی صحبت سے منع کرے۔ اُس کے حق میں یہ خیال نہ کرنا کہ وہ اپنے آپ کو پرہیزگار اور متقی ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے۔ نیز جہانتک ہو سکے اپنے مرید کی تعریف نہ کرے کہ ہمارا فلانا مرید خلوت میں چاند اور ستارے دیکھتا ہے۔ کیونکہ شاگرد کی تعریف گویا اپنی تعریف ہے۔ کامل اولیاء کبھی ایسے حالات کا افشار نہیں کرتے۔ اور کسی حالت میں اُن کو مریدوں اور شاگردوں کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ اگرچہ اُن شاگردوں سے مدۃ العمر بھی خوارق و کرامات ظاہر ہوتی رہیں۔ بلکہ وہ ایسے امور سے بیزار ہوتے ہیں اور جس میں شائبۂ اُلوہیت پایا جاوے اُس سے کنارہ کش رہتے ہیں اور خلقت کو محض عبودیت کی طرف بلاتے ہیں اور اپنے کام

سے کام رکھتے ہیں اور کسی کے رد و قبول و تردید و تائید کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اسی واسطے رسولوں کو جب قیامت کے روز پوچھا جائیگا کہ لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا اور تمہاری دعوت کی اجابت کا کیا حال رہا۔ تو وہ کہیں گے ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے ہمیں اپنے کام سے کام تھا۔ ان مزید حالات کو تو تو ہی جانتا ہے۔ حقیقت میں واقعہ بھی یہی ہے۔ واہ سبحان اللہ کیا عالی مقام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سلوک کا راستہ بڑا کٹھن ہے اور یہ منزل بڑی کڑی ہے۔ اس کے اندر بتیاروں یا کنوؤں کا سامنا ہے جس سے تھوڑے ہی نجات پاتے ہیں۔ اسی واسطے قطب ربانی ابوالحسن شاذلی کا قول ہے کہ اس گروہ میں بھی ناجی (نجات پانے والے) کم ہیں اور ہالک (ہلاک ہونے والے) زیادہ۔ خصوصاً وہ زیادہ ہلاکت کے منہ میں ہے۔ جو صلاحیت سے مشہور ہے اور خلقت اس پر متوجہ ہے اور اس کے حق میں اعتقاد و ارادت رکھتی ہے اور تعریف و توصیف کرتی ہے۔ سیدی شیخ احمد بن رفاعی اپنے شاگردوں کو کہا کرتے کہ "دم بنو نہ سر بنو" کیونکہ سب سے پہلے چوٹ سر پہ پڑتی ہے۔ یعنی مستور رہنا مشہور ہونے سے اچھا ہے۔ اللہ مسلمانوں کو توفیق دے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ اگر اسے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہدایت خلق کے واسطے خاص اجازت مل جائے تو اس سے وہ ہمعصروں پر فخر نہیں کرتا اور اپنے آپ کو خاصوں میں شمار نہیں کرتا۔ اور اپنا درجہ ان سے اعلیٰ نہیں خیال کرتا۔ بلکہ اپنے آپ کو غیروں کے مساوی سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نیند میں اجازت مل جانا کوئی خصوصیت و بزرگی کی بات نہیں ہے۔ جب کہ نص قرآن و حدیث سے

ہر ایک شخص بیداری میں نصیحت و خیر خواہی کے واسطے مامور ہے۔ اور بیداری کی بات بہ نسبت خواب کے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ کیونکہ خواب کی حالت پر اتنا اعتماد نہیں ہوتا جتنا کہ حالت بیداری پر۔ نیز ممکن ہے کہ مکر و استدراج کی حالت ہو۔ علاوہ اس کے محقق عارفوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اذن خاص صرف قطب کو ہی ہوتا ہے نہ دیگر اولیاؤں کو۔ پس جو شخص اذن خاص کا مدعی ہے وہ گویا قطب غوث کامل و اکمل ہونے کا مدعی ہے۔ اور ایسا شخص اگر اس گروہ کو ہو اور ظاہری فقیہہ مجذوب الحال نہ ہو تو اولیاء کے نزدیک ممنوت و مجذوب ہے اور فقیہہ زاہد خشک ہونے کی حالت میں مخبوط و مجنون ہے۔ اس حالت میں تو قابل مسخرہ و ظرافت ہے اور فقیری کی حالت میں قابل سیاست و ذلت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ اگر کوئی بادشاہ کا ملازم و خادم نہ ہو کر یہ دعوے کرے کہ میں بادشاہ ہوں تو لوگ اس پر ہنسی اڑائیں گے اور مجنون اور مخبوط الحواس کہیں گے۔ اور اگر یہ دعویٰ کسی کارکن درباری و خادم حضوری سے ہو تو وہ سیاست و عقوبت کے شکنجے میں کھینچا جاتا ہے۔ اگر اذن نیند میں رویت صحیحہ اور شروط صادقہ کے موافق واقع ہوا ہو تو کسی کے آگے ذکر نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ کمزوری و عدم استقلال کی علامت ہے لیکن اگر تو نیند میں لوگوں کے ارشاد کے واسطے صراحتاً مامور کیا جاوے اور اس کے ذکر کی اجازت مل جاوے تو فرمان بجا آوری کی نیت و غرض سے ظاہر کرے نہ کسی اور مطلب کے واسطے۔ کیونکہ بے غرض نصیحت اور بے مطلب دعوی میں کم آفتیں ہیں ورنہ دنیا کے لئے دین فروخت کرنا ہے۔ اور لوگوں کی میل کچیل (صدقات و خیرات و زکوٰۃ وغیرہ) کو در آبدار (دین متین) کے عوض

میں خریدنا ہے اور لوگوں کے دلوں میں اپنی ولایت کا اعتقاد بٹھانا ہے۔ تاکہ اُس کے لئے جس چیز کی ضرورت دیکھیں جھٹ خرید کر حاضر کر دیں۔ اور لوگ بھی ایسی عقل کے اندھے ہوتے ہیں کہ اس کے واسطے تو جان تک ہارنے کو تیار ہوتے ہیں اور کسی یتیم و مسکین کے واسطے ایک کوڑی دینے سے جان جاتی ہے۔ نیز یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ لوگوں کے جاننے و ماننے سے ہی شیخ بن سکتا ہے۔ نہیں اگر کوئی شخص بازار میں کھڑا ہو کر مثلاً ایک ہزار آدمی کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا وعظ کرے تو وہ اُن سب کا شیخ ہے خواہ وہ جانیں یا نہ۔ اور مانیں یا نہ۔ بلکہ اُس شخص کی نصیحت اگر بے غرض ہے اور طالب شہرت نہیں ہے۔ اور اس پیشہ سے ذریعۂ معاش حاصل نہیں کرتا بلکہ کسی صنعت و دستکاری سے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ تو یہ شخص عنداللہ بہت نیک مرد ہے اور خدا کے نزدیک اُسے بڑا ثواب ہے۔ کیونکہ جو شخص دوسروں کی روٹی سے عبادت کرتا ہے وہ عبادت اُس کی نہیں ہوتی۔ بلکہ روٹی کھلانے والے کی ہوتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جو حالات و واقعات بیان کرتا ہے اُن میں ثابت قدم رہتا ہے۔ اگرچہ یہ بات (اظہار واقعات) ناقص ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ جب اس پر کوئی مصلحت دینی مترتب نہ ہو پس تجھے چاہیئے کہ اس بات سے پرہیز کرے کہ "میں خدا کی طرف سے ارشاد خلق و ہدایت عوام کے لئے بیٹھا ہوں" کیونکہ یہ دعویٰ محقق عارفوں کے اجماع سے ممنوع ہے۔ وجہ یہ کہ رسول اللہؐ کے بعد امر و نہی کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک اوامر و نواہی کو اپنے رسولؐ کی زبان سے بیان کر چکا ہے۔ (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ

عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي[۱] الخ) اس پر شاہد صادق ہے۔ نیز حدیث ذیل (مَا تَرَكْتُ[۲] شَيْئًا يُقَرِّبُكُمْ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اِلَّا قَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَلَا شَيْئٌ يُبْعِدُكُمْ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلَّا وَقَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ حدیث) بھی وضاحت سے اس مضمون کو ظاہر کر رہی ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ اب کسی قسم کا امر و نہی خدا کی طرف سے کسی پر نازل نہیں ہوتا۔ کیونکہ شریعت کامل ہو چکی ہے اور اس کے تمام مراتب و مدارج بیان ہو چکے ہیں۔ یہ ممانعت اُس حالت میں ہے جب کہ کوئی شخص اس قسم کا دعوےٰ وساطت سے کر لیوے اور کہے کہ مجھے فرشتے وغیرہ کے ذریعے سے ایسا القا ہوتا ہے اور اگر بلا وساطت دعوےٰ کر لے تو یہ دعویٰ سابق سے بُرا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ اس کو بھی موسیٰ کی طرح مکالمہ الٰہی حاصل ہے اور اس کا کوئی قائل نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو شریعت کے دقائق و معارف و علوم دقیقہ اور اخبار غیبیہ معلوم ہوتے رہیں۔ لیکن اوامر و نواہی کا دروازہ مطلقاً بند ہے۔ جو شخص رسول اللہؐ کے بعد ایسا دعوےٰ کرے وہ مدعی شریعت جدیدہ ہے خواہ اُس کے احکام شرع کے موافق ہوں یا مخالف پس اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک امر و نہی شریعت کے اندر ہے کسی شخص کو خلاف شرع امر و نہی بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ تمام مخلوق اس کام میں شریعت کے تابع ہے اور جس کو یہ وہم پڑے اور اُس کے دل سے

---

[۱]۔ آج ہم نے کامل کر دیا دین کو اور پوری کر دی نعمت اپنی۔

[۲]۔ ہر ایک چیز جو خدا کے قریب کا وسیلہ ہے میں نے اُس کے بجا لانے کا حکم دیدیا ہے اور جو چیز جدائی اور دوری کا باعث تھی اُس سے میں نے تم کو منع کر دیا ہے۔

یہ آواز آئی کہ تو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اُسے سمجھنا چاہیئے
کہ وسوسۂ نفس و خدشۂ خاطر ہے۔ ہمارے دوستوں میں سے ایک کو
یہی غلطی لگی۔ وہ ہمارے شیخ کے پاس آیا۔ اور ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے
فرمایا۔ اے بچے یہ خیال نفسانی و جذبہ شیطانی ہے۔ سبب اس کا یہ
ہے کہ جیسا تو اپنے باطن کو طلب مشیخت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ریاضت
و خلوت و ذکر و فکر سے چاہتا ہے کہ تجھے مشیخت کا اذن حاصل ہو جائے
تو دل کی تمام طاقت کو اس طرف لگاتا ہے۔ جب وہ توجہ تجھ پر غالب ہو جاتی
ہے اور تیرے دل پر قابو پا لیتی ہے تو تیرا نفس تجھ پر حاکم ہو جاتا ہے۔ اور جو
کچھ وہ کہتا ہے تو اُس کو خدا کی طرف سے خیال کرتا ہے اور اُس کی
مخالفت نہیں کر سکتا۔ اور اس خیال کو اپنے دل سے رد نہیں کر سکتا۔ اور اس
قوت نفسانی کو طاقت رحمانی خیال کرتا ہے۔ جب اُس نے یہ تقریر سنی
خاموش ہو گیا۔ اور استغفار و توبہ کی اور اس خیال سے باز آیا اور لوگوں کی
تلقین و تعلیم کو چھوڑ دیا۔ اور سلسلۂ پیری و مریدی سے بیزار ہو کر لوگوں سے
جدا ہو گیا۔ اگر ہر ایک شخص جس کو اس قسم کے وساوس نفسانی پیش آویں۔
اُن کو کامل عارف پر پیش کرے تو اُس پر خیالات نفسانی اور احکام رحمانی
کا فرق منکشف ہو جائے اور پھر وہ اس سلسلہ کو چھوڑ دے اور کبھی اس میں
قدم نہ دھرے اور مریدوں کے چھوٹ جانے اور معتقدین کے متفرق ہو جانے کی
پرواہ نہ کرے۔ جب تجھے کوئی ایسا واقعہ پیش آوے اور کسی عارف کامل
پیش نہ کر سکے اور تیرے دل میں وسوسہ نفسانی ہونے کا خیال نہ گزرے تو
اس کو فرشتہ کی طرف سے جاننا چاہیئے۔ نہ اللہ کی طرف سے۔ سیدی شیخ
یوسف عجمی کو یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کو تین دفعہ حکم ہوا کہ تم زمین مصر میں جاؤ

اور لوگوں کو ہدایت کرو،، مگر آپ نے اس کو نہ شہادت نہ دلیل کے قبول نہ کیا۔ اور وہ یہ کہ کہا کہ اے اللہ اگر یہ خیال حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو اس نہر کو خالص دودھ بنا دے تاکہ میں اس سے پیالہ بھر کر پی لوں۔ نہر کا پانی اسی وقت خالص دودھ بن گیا۔ اور انھوں نے پیا اور اس کے بعد وہ شہر مصر کی طرف گئے۔ دیکھو عارف یہ ہوتے ہیں۔ اگر ہاتف کے کلام سے کسی کو اجازت ملے تو وہ تین حالتوں پر محمول ہو سکتی ہے۔ یا فرشتہ کی آواز ہوگی یا جن کی یا ابلیس کی۔ کیونکہ ابلیس بھی اللہ کے ارادہ سے عارفوں کا اغوا کر سکتا ہے اور یہ بات کہ "خدا کے بندوں پر شیطان کا غلبہ نہیں ہوتا" یہ بھی اللہ کے ارادہ سے مقید ہے۔ یعنی اگر اللہ چاہے تو اپنے بندوں پر شیطان کا غلبہ نہ ہونے دے۔ لیکن واجب نہیں ہے اور خدا مجبور نہیں ہے کہ ان پر شیطان کا غلبہ نہ ہونے دے۔ خدا کی مرضی ہے جو چاہے سو کرے وہ کسی امر کا مقید نہیں ہے (یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَ یُثْبِتُ۔ وَکُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ) جس کو چاہے محو رکھے اور جس کو چاہے برقرار رکھے ہر ایک وہ کسی نہ کسی ادھیڑ بن میں رہتا ہے اور کامل آزادی رکھتا ہے۔ البتہ انبیاء شیطان کے شر سے محفوظ ہیں کیونکہ وہ معصوم ہیں۔ علاوہ اس کے حفاظت کا وعدہ ان کے لئے ہے جو اس کے بندے ہیں اور خدا کا بندہ ہونا کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے جو کہنے میں تو آتا ہے مگر دیکھنے میں نہیں آتا۔ اگر کوئی عقل و فکر کی آنکھ کھول کر دیکھے تو اپنے نفس کو گوناگوں ہوا و ہوس سے بھرا ہوا پائیگا۔ (اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ)[1] کا مضمون صادق آئیگا۔ لفظ ہونے سے انسان کا وہ فعل یا ارادہ مراد ہے جو

---

[1] کیا تو نے وہ شخص دیکھا ہے جس نے اپنا معبود اپنی ہوا و ہوس کو ٹھیرایا ہے۔

میزان شرعی کے مخالف ہو اس سے سوائے کامل اولیاؤں کے دوسرا نہیں بچ سکتا۔ سوائے کامل اولیاؤں کے غیروں کی خواہشات و جذبات مختلف ہیں۔ ایک کی خواہش شہرت کی ہے دوسرا اس سے نفرت کرتا ہے جس سے لوگوں کو وہم میں ڈالتا ہے کہ وہ شہرت کو پسند نہیں کرتا۔ کسی کی خواہش صاف ستھرا لباس پہننے کی ہے کوئی اس کو ترک کرتا ہے اور میلے کچیلے کپڑے پہنتا ہے کوئی چاہتا ہے کہ لوگوں کے حلقہ میں سجادہ و مصلے پر بیٹھے۔ کوئی اس کے مخالف ہے۔ کسی کی خواہش ہے کہ وہ گھر سے بازار کی طرف نہ نکلے مگر خاص وقتوں میں۔ تاکہ اس کی عزت لوگوں کے دلوں سے زائل نہ ہو جائے مگر فقیر ان باتوں سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ لوگوں کا آنا نہ آنا اُن کے نزدیک یکساں ہوتا ہے۔ کوئی چاہتا ہے کہ خلوت میں ذکر میں مصروف رہے لوگوں کے اجتماع اور اُن کی تواضع و تعظیم سے بھاگتا ہے۔ کوئی اس کے برعکس ہے۔ کسی کی یہ خواہش ہے کہ مجاورین و زائرین اُس کے پاس ہمیشہ اقامت رکھیں کیونکہ وہ خیال کرتا ہے کہ انہیں کے ذریعے سے رزق ملتا ہے اور لوگ ان کی خاطر صدقات و خیرات دیتے ہیں اور اُن کے ہونے سے وہ لوگوں کی آنکھ میں بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے اور جس شیخ کے پاس کوئی زائر نہ آوے لوگ اس کو شیخ نہیں سمجھتے۔ جس کے پاس بہت سے مرید ہوں اُس کا ادب کرتے ہیں اور اس کے سامنے سرنگوں ہو کر بیٹھتے ہیں۔ اس کی خدمت میں قائم رہتے ہیں۔ جب وہ سوار ہوتا ہے تو اُس کے آگے آگے دوڑتے ہیں۔ جب کسی ولیمہ و ضیافت میں جاتا ہے تو اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں کسی کی خواہش لوگوں کو کھانا کھلانا اور اُن کا دل ہاتھ میں لانا ہوتی ہے۔ کوئی تقویٰ و پرہیزگاری و زہد کو پسند کرتا ہے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ بدکاروں کی لموں و

سرکشوں کو ظلم و سرکشی سے باز رکھے۔ کوئی ایسا ہے جو ان تمام باتوں و چیزوں
کی خواہش کرتا ہے۔ کوئی ان تمام سے پاک و آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ
پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ جس طرح اشیائے مذمومہ کا کرنا خواہش ہے
اُسی طرح اُن کا ترک کرنا بھی ایک خواہش ہے۔ عکس کی حالت میں بھی یہی حالت
ہے۔ کیونکہ نفس کا کام ہے کہ مذمت سے نفرت کرتا ہے۔ جب کسی اپنے
ہمعصر کو دیکھتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے حقیر خیال کیا گیا ہے۔ تو وہ بھی اُس سبب
و کام سے پرہیز کرتا ہے اس خوف سے کہ لوگ اُس کو حقیر سمجھیں گے۔ نہ اللہ
کے خوف سے۔ پس اُس وقت پرہیز و اجتناب کرنا خواہش نفسانی ہے۔
ایسا ہی نفس خوش ہوتا ہے۔ جب سنتا ہے کہ لوگ اُس کے حق میں کہتے ہیں
کہ فلانا مشیخت و بزرگی کو پسند نہیں کرتا۔ اور اُس کی راہوں سے بھاگتا
ہے۔ حالانکہ وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ جب وہ سوار ہو لوگ اس کے پیچھے
چلیں اور بڑے بڑے لوگ اُس کی رکاب میں چلنا فخر سمجھیں۔ لیکن وہ ایسی
باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ سوائے کامل ولیوں کے کوئی
وساوس شیطانی و خواہشات نفسانی سے بچ نہیں سکتا۔ جو شخص پورے
تیراک کی مشابہت کر کے دریا میں نازل ہو اور تیرنا نہ جانتا ہو وہ ضرور ہلاک
ہوگا۔ اور غرق ہوگا۔ پس یہ بات سمجھ رکھ اور اللہ سے ہدایت مانگ کہ وہی
نیکو کاروں کو ہدایت کرتا ہے۔

دیگر علامت اُس کی یہ ہے کہ وہ اس بات کی خواہش نہیں کرتا کہ
اُس کو اپنے شیخ یا کسی دوسرے سے لوگوں کو تلقین کرنے اور ارشاد کرنے
کی اجازت حاصل ہو جائے۔ کیونکہ اذن سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ
اسی حال پر رہ سکے گا اور وہ درجہ اُس سے منسوب نہیں ہوگا۔ اور خدا کے

غضب میں گرفتار نہیں ہوگا۔ تاکہ اُسے اطمینان ہو جاوے اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ وہ اس حالت سے نہیں گرے گا۔ تو کیا خدا اس کا مقید ہے کہ اس کے اقرار کو پورا کرے۔ اس کی ماہیت تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ جس نے (کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ وَ یَمۡحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ وَ عِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ) کی حقیقت سمجھی ہو۔ علاوہ اس کے وہ اپنی حالت کو ہر وقت کمی و بیشی پر دیکھتا ہے۔ پس نقصان کی حالت میں اُس کو دوسرے شیخ کی ضرورت ہو گی جو اسے درجہ تکمیل تک پہنچائے۔ اور زیادتی کی صورت میں اذن جدید کی ضرورت ہوگی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ اذن و اجازت کی کسی حال میں ضرورت نہیں اور کوئی حالت قابل اطمینان نہیں۔ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ کور باطن دل کا اندھا ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ بیدار مغز ذکی الطبع ہوتا ہے۔ ہر ایک شخص سے اُس کی استعداد و قابلیت کے موافق گفتگو کرتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں یہ دروازہ بند ہو گیا ہے۔ کیونکہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ اسرار حقیقت اُن کے آگے بیان کئے جاویں۔ اسی واسطے مدت دراز سے عامل عارفوں مثل سیدی شیخ ابراہیم المتولی اور سیدی ابوالعباس اور سیدی محمد بن عنان و سیدی المنیر نے اس دروازہ کو بند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سیدی محمد العمری انتقال کر گئے تو لوگوں نے اُن کے بیٹے سیدی ابوالعباس العمری سے سلوک کی گدی پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے انکار کیا۔ لوگوں نے کئی بار الحاح و اصرار کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ طالب حق کہاں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ سچی تلاش اور طلب صادق کسی میں نہیں ہے۔ پھر ان میں سے کسی نے جرأت نہ کی۔ وہ اپنے خیال سے باز آ گئے۔ کیونکہ ان کے دل

گواہی دیتے تھے کہ ان کا فرمانا حق ہے۔ بزرگان سلف کا یہ حال تھا کہ صائم الدہر و قائم اللیل رہتے تھے۔ اور موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے۔ اور آپس میں ان کی یہ کیفیت ہوتی کہ اگر کوئی مباح چیز کو بھی استعمال کرتا تو اس سے الگ ہو جاتے۔ اور کہتے کہ فقراء کا کام ریاضت اور اجتہاد و نفس کشی ہے نہ آرام طلبی و تن پروری۔ اور وہ کسی کو اس طریق کے قابل نہیں دیکھتے تھے شیخ ابراہیم المتولی رح کی وفات کے وقت ان سے کہا گیا کہ حضرت آپ کے بعد حجرۂ نبویہ کی خدمت کا متولی کون ہوگا۔ کہا کہ ایک شخص جس کو محمد بن عنان کہیں گے اور وہ بلاد مشرقیہ سے ظاہر ہوگا۔ دیکھو کہ ولی ولی کی شہادت دیتا ہے اور اس کے وجود سے پہلے اس کی ولایت کی خبر دیتا ہے۔ باوجود اس کے وہ اس زمانہ میں مشہور نہیں تھا۔ کیونکہ وہ شہرت کو پسند نہیں کرتے تھے اور لوگوں کو اس قابل نہیں دیکھتے تھے کہ ان سے خطاب کیا جائے۔

دوسرے بزرگ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے کیونکہ وہ کامل تھے اور اللہ کا ادب کرتے تھے۔ اور قضا و قدر کی گردش کو جہان میں دیکھتے تھے اس لئے وہ اس چیز کے عمل کا ارادہ نہیں کرتے تھے۔ جس کے نقصان کو خدا چاہتا ہو۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودات کی کمی کا ارادہ کیا ہوا ہے۔ جیسا کہ (اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا)[1] سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے شیخ محمد الشناوی سے لوگوں نے درخواست کی کہ ان کی وفات کے بعد مجھ فقیر کو ان کی تلقین کے لئے نامزد کیا جائے۔ میں نے انکار کیا۔ لوگوں نے شیخ کے قول کو کہ "میں ان کے بعد خلیفہ ہوں" پیش

---

[1] کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کے چاروں طرف سے کمالات کو گھٹائے جاتے ہیں۔

کر کے سخت اصرار کیا۔ لیکن مجھے اُن کی تلقین سخت ناگوار و دو بھر معلوم ہوتی تھی۔ آخر میں نے چند شخصوں کو تلقین کی۔ پس میں نے دیکھا کہ میں گویا مضبوط جوتیاں سی رہا ہوں۔ جب پوری کر چکتا ہوں تو خود بخود کھل جاتی ہے جیسے کہ پہلے تھی۔ پس میں سمجھ گیا کہ اب زمانہ تلقین کا نہیں رہا۔ اور لوگوں سے استعدادیں سلب ہو گئی ہیں۔ میں نے زمین و آسمان کے مابین ایک لکھی ہوئی تختی دیکھی۔ اُس کے مضامین میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے وجود و کمال کی کمی کا ارادہ کیا ہے ۷۶۶ھ چھ سو چھیاسٹھ ہجری کے بعد ہر چیز میں زوال شروع ہو جاوے گا۔ پس اس وقت میں جو شخص اس دروازہ میں داخل ہونے کو ابتلاء نہیں سمجھتا وہ بے ادب و گستاخ ہے۔ کیونکہ وہ اس چیز کو کامل کرنا چاہتا ہے جس کو خدا ناقص کرنا چاہتا ہے (وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ) لیکن ایسا شخص معذور ہے کیونکہ اس کا حجاب دور نہیں ہوا۔ اگر اُسے بھی عارفوں کی طرح مکاشفہ ہو جاتا اور حقیقت حال منکشف ہو جاتی تو وہ خواہش کرتا کہ زندہ ہی دفن کیا جاوے اور اس دروازہ کو چھوڑ دیتا اور یہ حجاب کے نہ رفع ہونے کا باعث ہے کہ ہزاروں کو تلقین کرتا ہے۔ اور کوئی اُس سے نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ جیسا کہ ضرب سرد لوہے میں اثر نہیں کرتی۔ اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم ذکر و تلقین کے چھوڑ دینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ جس شخص کے لئے یہ دروازہ کھل جائے۔ اُس کو چاہیئے کہ اس کو اپنے حق میں ابتلا خیال کرے اور یہ خیال کرے کہ میں مشیخت و بزرگی کے لائق نہیں ہوں۔ لیکن شاگردوں و طالبان حق کے لئے تلقین و ذکر و اذکار اچھا ہے۔ کیونکہ وہ حق کے طالب ہوتے ہیں اور اپنے نفوس کو حقیر و ذلیل تصور کرتے ہیں۔ شیخ کا اپنے معتقدین و

مریدین کے سامنے یہ زبانی مقولہ (کہ میں تو اس دروازہ کا اہل نہیں ہوں میں
تو بلا ریں مبتلا ہوں) کچھ مفید نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے لوگ زیادہ تعظیم کرینگے
اور کہیں گے کہ دیکھو باوجود اس قدر کمال وجلال کے شیخ کیسا متواضع ہے اور
اپنے نفس کو کیونکر حقیر سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ اس دعوے میں صادق نہیں ہے
کیونکہ اگر صادق ہوتا تو اللہ سے اس بلاء سے چھوٹنے کی درخواست کرتا
اور نہایت گریہ وزاری سے اس مصیبت سے رہائی کے لئے دعا کرتا اور
فقراء سے دعا منگواتا۔ کہ وہ اس بلاء سے چھوٹ جاوے۔ جاننا چاہیئے کہ
جو شخص اس زمانہ میں مشیخت کا دروازہ کھولتا ہے اس کی مثال اس فقیہہ کی سی
ہے جو غروب شمس کے وقت کتاب کھولے اور لڑکوں کے انتظار میں بیٹھے۔
تاکہ اُن کو پڑھا دے۔ کیونکہ اس وقت ہم قیامت کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔
اور ہر ایک چیز اپنے موضوع ومفہوم سے خارج ہو گئی ہے اور قرب قیامت
کی وجہ سے اپنے مرکز سے نکل گئی ہے۔ جیسا کہ اہل کشف اس کو محسوس کر رہے
ہیں دیکھو کہ جب سواری سفر کے بعد شہر کے نزدیک آتی ہے تو اس کی باگ
چھوڑ دی جاتی ہے۔ ایسا ہی جب حاجی لوگ سفر سے واپس آتے ہیں اور
وطن کے نزدیک پہنچتے ہیں تو اُن کی قطاریں وصفیں متفرق ہو جاتی ہیں۔ اور
اُن کے انتظام کی لڑی پراگندہ ہو جاتی ہے۔ پس اس وقت مشیخت کا
طالب اُس کی مانند ہے جو حاجیوں کی پراگندہ صفوں کو جمع کرنا چاہے لوگ
اس کی عقل پر ہنسیں گے۔ پس اس زمانہ میں جو ہر بدی کا فاتح (کھولنے والا)
ہے اور ہر نیکی کا خاتم (ختم کرنے والا) ہے مشیخت کا طالب عقل کا اندھا ہے
عوام اس پر پھبتیاں اڑائیں گے اور کہیں گے فلانا مشیخت کا عامل ہے گویا
بزرگی وپیری بھی ایک قسم کا عمل ہے۔ پس جو شخص مشیخت کو عمل خیال کرتا ہے

اُس کے واسطے اُس کا حاصل کرنا آسان ہے کیونکہ یہ بات تو دعوئی سے
حاصل ہو جائے گی۔ لیکن لوگ مشائخ کو بھی خفیف سمجھیں گے اگرچہ وہ
نفس الامر میں شیخت کے اہل بھی ہوں اور اُن کا اعتقاد فاسد ہو جائیگا اور
وہ اُن کے کلام سے مستفید نہیں ہوں گے۔ تاکہ اللہ اپنے ارادہ کو پورا کرے
اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درجہ ولایت تک نہ پہنچنے کی وجہ یہ نہیں ہے
کہ شیخ میں طریق سلوک کی ہدایت نہیں۔ بلکہ اس سے روکنے والا اللہ کا
ارادہ ہے اسی واسطے انبیاء علیہم السلام باوجود معصوم اور اپنے دعوی میں
صادق ہونے کے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے سے قاصر رہے اور تھوڑے
ہی لوگوں نے اُن کی اطاعت کی اُس کی وجہ یہی تھی کہ جو کچھ اللہ کے ارادہ
میں ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس سے یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا جو بعض کہا
کرتے ہیں کہ اگر فلانے واعظ کے کلام میں تاثیر ہوتی تو سامعین کے دل میں
اثر کرتی۔ کیونکہ ہر ایک چیز اللہ کے ارادے میں ہے۔ پس اے بندہ خدا اپنے
اور اپنے بھائیوں اور دوستوں اور تمام مسلمین کے واسطے حسن خاتمہ کی دعا
کرتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں حرمت اسلام پر مرجانا ہی بہت بڑی
غنیمت و نعمت ہے۔ جھوٹے مدعی اگر دعوے سے الگ ہوکر اپنے
گریبان میں دیکھیں اور نظر انصاف سے اپنے اندر کو ٹٹولیں تو وہ اپنی
حالت عوام مسلمین کی سی بھی نہیں پاویں گے۔ چہ جائیکہ دوستوں و عارفوں
کے درجے میں شمار کئے جاویں۔ پس اے بھائی ان امور پر عمل کر اور خدا
سے نیک عمل کی توفیق مانگ اور اس نصیحت کو خیر خواہی سے قبول کر لے کہ
اس وقت میں کوئی شیخ ایسی باتیں نہیں بتلائے گا۔ اگر تو قبول نہیں کرے گا تو اس
کا وبال و عذاب تجھ پر ہوگا۔ جاننا چاہئے کہ جو شخص اپنے بھائی کے عیوب

دلق نفس کو ظاہر کرتا ہے وہ عیوب خود ہی اُس کے دل پر گزرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی کسی کو عیب چھوڑنے کی نصیحت نہ کرتا کیونکہ جب خود اُسے اس عیب کا علم نہیں ہے تو وہ دوسرے کو کیونکر نصیحت کر سکتا ہے پس معلوم ہوا کہ تمام خلقت عیوب میں مشترک ہے۔ لیکن مراتب میں مختلف ہیں بعض ہمیشہ اس پر رہتے ہیں اور اُن کے عیوب بڑھتے جاتے ہیں۔ بعض اس پر ہمیشہ نہیں رہتے اور عیوب بھی کم ہو جاتے ہیں۔ بعض کو خدا نے میزان (کتاب و سنت) دی ہوئی ہے وہ اپنی خواطر و خواہشات اُس پر وزن کرتے ہیں اگر وہ کتاب و سنت کے موافق ہوتے ہیں۔ تو قبول کر لیتے ہیں ورنہ رد کر دیتے ہیں اور بعض اللہ کے ارادہ کے ماتحت رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ آیات متشابہات و صفات الٰہیہ و اسماء خداوندیہ۔ و حروف مقطعات میں زیادہ خوض نہیں کرتا۔ یہ مرض اس زمانے کے اکثر فقراء میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ رات و دن اسی میں کلام کرتے رہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ طاعت و عبادت سے افضل ہے۔ لیکن یہ اُن کی غلطی ہے۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ بہت بولنے والے دوزخ میں سر کے بل گرائے جائیں گے۔ علاوہ اس کے جو خوض و غور کرتا ہے وہ قاصر الفہم ہوتا ہے نہ تحقیقاً و ذوقاً۔ چنانچہ وہ شیخ محی الدین کی کتابیں مطالعہ کرتا ہے اور اس کے کلام کے محل و منشاء کو نہیں سمجھتا۔ پس خود ہی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے اور اُن کے عقائد کو بگاڑتا ہے۔ حالانکہ شیخ محی الدین کا قول ہے کہ جو شخص ہمارے درجے کا نہیں ہے اور ہمارے مقام پر نہیں پہنچا ہے اُس پر ہماری کتابوں کا مطالعہ حرام ہے۔ پس عارف کے سوا آیات متشابہات وغیرہ میں خوض کرنا دوسروں کے لئے غیر مفید و مضر

ہے۔ جو شخص اس قوم کی کلام کے حفظ کرنے میں مشغول ہوتا ہے اس کے لئے
ایک اور عمر چاہیئے کہ وہ اُس قوم کے الف سے فارغ ہو اس فرقہ کے کلام نہایت
وسیع ہیں۔ کیونکہ ہر ایک ان میں اپنی اپنی محبت و ذوق کے مطابق کلام کرتا ہے
اس لئے وہ کلام غیر محدود و غیر محصور ہوتی ہے۔ اور اس دریائے محبت میں
بہت خلقت نے غوطے لگائے ہیں۔ مگر کوئی اس کی گہرائی تک نہیں پہنچا۔
قطب ربانی سیدی ابراہیم الدسوقی نے کہا ہے کہ تمام مأوّلین و مفسرین قرآن
شریف کے ایک حرف کے معارف و دقائق تک بھی نہیں پہنچے۔ اور کلام
اللہ کے ایک کلمہ کی معرفت و حقیقت کو نہیں پا سکے۔ شیخ عارف باللہ شیخ
افضل الدینؒ نے تفسیر سورۂ فاتحہ میں کہا ہے کہ جب کہ مخلوق حقیقت بیان
میں نہیں آسکتی تو کلام اللہ کی حقیقت کیونکر تعبیر میں آسکتی ہے۔ حالانکہ وہ
کل چیزوں کا مجموعہ ہے۔ یا حادث کیونکر قدیم کو محیط ہو سکتا ہے پس حق یہ ہے
کہ اس کے ادراک سے عاجز ہونا ہی ادراک ہے بھلا جو موجودات
حادثہ میں سے بھی کسی چیز کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا وہ قدیم بالذات کی حقیقت
و ماہیت کو کیونکر تعبیر کر سکتا ہے۔ پس اس مقام میں دم بخود ہونا ہی سعادت
ہے اور عاجزی کا دم مارنا ہی مشیخت ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے قول کی (کہ فلانا شیخ
کامل ہے) طرف توجہ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے ولایت و مشیخت
کی بو بھی نہیں سونگھی اور اگر لوگوں کے عرف کے موافق وہ شیخ ہے تو وہ
خطرہ و ہلاکت میں ہے۔

اور شیخ کا لفظ اُس پر صادق آتا ہے جو صراط و میزان وغیرہ احوال
قیامت سے تجاوز کر گیا ہو اور اللہ کے مقت و غضب سے کسی حال میں

غافل نہ ہو۔ اور جب تک خاتمہ بالخیر نہ ہولے اعمال صالحہ پر اعتماد نہ کرے
جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر میں انسان اہل جنت کے سے
عمل کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اہل دوزخ سے ہوتا ہے۔ اسی واسطے بعض عارفوں
نے کہا ہے کہ میں ہرگز اُمید نہیں کر سکتا کہ آخرت میں مامون و محفوظ ہو جاؤنگا
کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں کسی کا مقید نہیں ہے جو چاہتا
ہے کرتا ہے۔ اُس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے۔ اور اسی امر کو ذہن
نشین کرنا ادب ہے۔ دیکھو انبیاء و ملائکہ باوجود معصوم و مصئون ہونے
کے ہمیشہ کانپتے رہتے ہیں اور فرشتوں کے یہاں پر جلتے ہیں۔ دیکھو جب
ابلیس راندہ گیا تو جبریلؑ و میکائیلؑ نے کس طرح رونا شروع کیا تھا۔
اور پھر خُدا نے انہیں کہا تھا کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے اور میرے مکر (کام و
منصوبہ) سے بے کھٹکے نہیں ہونا چاہیئے۔

فصل

جاننا چاہیئے کہ اس باب میں ہم نے اللہ کے ارادہ سے کلام کو طول دے دیا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دعاوی باطلہ و وساوس کاذبہ و خواہشات قبیحہ اس طریقہ کے طالب کو سرنگوں و ذلیل کر دیتی ہیں اور یہ امور کلیۃً عبودیت کے منافی و مخالف ہیں۔ اور ہم نے اس رسالہ کو آداب عبودیت کے واسطے بنایا تھا۔ کیونکہ سب سے افضل عبادت آداب عبودیت ہیں جیسا کہ آیت ذیل (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ) سے ثابت ہوتا ہے یعنی جن و انسان میں سے اچھے وہ ہیں جن میں ربوبیت کا کوئی شائبہ نہ ہو کیونکہ عبودیت اور ربوبیت میں نسبت تضاد کی ہے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس پر عبودیت اور ربوبیت ہر دو صادق آسکیں۔ گویا بندہ وہ ہے جس میں ربوبیت کا کوئی پہلو نہ ہو اور رب وہ ہے جس میں عبودیت کا کوئی نشان نہ ہو۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو عبودیت کی علامت ذلت و انکسار و عجز و نیاز ہوئی اور تمام حالات میں اپنے آپ کو کم سمجھنا۔ نہ وہ دعویٰ جاہ و تکبر و فخر کو کام میں لانا۔ کیونکہ یہ صفات خداوندی ہیں اور بندہ کے واسطے ان صفات میں اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے اور اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جس کو اللہ دوست نہ رکھے۔ اگرچہ وہ طریق حق سے واقف بھی ہو وہ راہبر و مرشد ہونے کے قابل نہیں۔ جیسا کہ شیطان کا حال ہے۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے نفس کو بُرائی سے متہم رکھتا ہے اور اس کے کسی حال و مقال کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس کو کئی ہی دفعہ فسق خفی اور فجور و ریا و حب ریاست و مشیخت کی طرف منسوب کرتا ہے۔

پس جو شخص نفس کو ایسا خیال نہیں کرتا۔ وہ بیمار محتاج علاج ہے اور اپنے نفس کا معاون و مددگار ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اپنے نفس کے افعال پر نیک گمان کرتا ہے وہ کسی سے نصیحت سے ہرگز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو اس کے حق میں کہا گیا ہے وہ اس سے بچا ہوا ہے۔ اسی واسطے یہاں تک ہو سکتا ہے۔ وہ ان اعتراضات و عیوب کا جو اس پر کئے جاتے ہیں جواب دیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ نصیحت دوسروں کے لئے ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے کو عیب و نقصان کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اگر اپنے نفس کو بھی ایسا دیکھتا جیسے کہ غیروں کو دیکھتا ہے تو اس کو بھی نصیحت کے قابل دیکھتا اور پھر توبہ کرتا اور رجوع کرتا۔ لیکن اسے اپنا عیب نظر نہیں آتا کیونکہ وہ اندھا ہے اپنے عیوب پر اس کی نظر نہیں پڑتی۔ فافہم ذالک۔

دیگر علامت اس کی یہ ہے کہ جب وہ کسی کے حق میں نصیحت کے [illegible] واسطے سمجھتا ہے اور اس [illegible] کرتا ہے [illegible] اور جب وہ کسی کو [illegible] تو [illegible] کیونکہ وہ جانتا ہے کہ [illegible] ان میں [illegible] واسطے ہر حال میں کسی کی نصیحت [illegible] [illegible] کا قول ہے کہ ایک لحظہ میں صلح اور ایک آن

میں عداوت ہو سکتی ہے پس نصیحت کرنے والے پر واجب ہے کہ وہ نصیحت
کے وقت یہ خیال رکھے کہ منصوح (نصیحت کیا گیا) کی گردن خدا کے
ہاتھ میں ہے۔ یعنی جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے ارادہ سے ہو رہا ہے۔ میں اس کے
ارادہ کو تبدیل کرنے والا نہیں ہوں۔ صرف حکم بجا آوری کے لئے نصیحت کر رہا
ہوں۔ میری نصیحت کو ہدایت و ضلالت میں کچھ دخل نہیں۔ کیونکہ کوئی متحرک
و ساکن اس کے ارادہ سے خارج نہیں ہے۔ تاکہ ادب ملحوظ رہے۔ میں نے
ایک دفعہ دل میں ایک نصاریٰ پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس کا دل کفر
میں کیونکر خوش ہوتا ہوگا۔ ابھی یہ خیال ختم نہیں ہوا تھا کہ میں بھی اسی بلا
میں مبتلا ہو گیا۔ اور ایسا جنون ہوا کہ اسلام کا نام بھی ناگوار معلوم ہوتا تھا
لیکن میں اسی حال میں خوش تھا۔ کوشش کرتا تھا کہ توحید بیان کروں
لیکن طاقت نہیں پاتا تھا اور تثلیث کا قائل ہو گیا اور اسے گھٹانے
بڑھانے پر قادر نہ رہا۔ خدا کا اتنا فضل تھا کہ نماز کے اوقات پر مجھے ہوش آ
جاتا۔ یہاں تک کہ میں نماز سے فارغ ہو جاتا اور پھر مجنون ہو جاتا اور
نصاریٰ کے دین کی تعریف کرتا اس حال میں جمعہ کی عصر سے لیکر دوسرے
دن کی ظہر تک رہا۔ پھر اللہ نے اُس کی حقیقت مجھ پر منکشف کر دی۔ اور
اسی وقت میں نے اللہ کے قول (کَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ) ایسے
ہی ہم نے ہر قوم کے اعمال کو اُن کے لئے مزین بنا دیا ہے) کا اشارہ سمجھا۔ اور
مذاہب و ادیان کے اختلاف کی حقیقت سمجھی پھر میں کفار وغیرہ پر اعتراض
کرنے لگا اور یہ کام مجھے ضرر نہیں دیتا تھا۔ یہی حادثہ کسی عارف کے ساتھ
بھی واقعہ ہوا تھا اور وہ کئی سال کفر پر رہا تھا اور صوم و صلوٰۃ کے وقت
بھی ہوش میں نہ آتا۔ جب معلوم ہو گیا تو ناصح کو چاہئے کہ پہلے اس ذات کو

شناخت کرلے کہ جس کے ہاتھ کافروں و گنہگاروں کی گردن ہے ۔ پھر
اُن پر اعتراض کرے تو اس حالت میں اس پر کوئی ضرر عائد نہ ہوگا ۔ اور اس
حالت میں وہ اعتراض کرنے کا مستحق ہوگا ۔ کیونکہ اس وقت تو نے اللہ کے
ادب کو ملحوظ رکھا ہے اور امر بالمعروف کو قائم کر دیا ہے ۔ پس اس وقت
تو اس کے ساتھ منازعت کرسکتا ہے جو اللہ کے امر کی مخالفت کرتا ہے
اور منہیات پر سوار ہے ۔ کیونکہ تو دیکھتا ہے کہ اس کی گردن اللہ کے ہاتھ
میں ہے اور تو اور وہ ہر دو قہر کے ماتحت مشترک ہیں ۔ اور قضاء ربانی اور
مشیت یزدانی کے مظہر ہیں ۔ ممکن ہے کہ جس کو تو اس وقت بُرا خیال کر رہا
ہے وہی امر تیری طرف منتقل ہو جائے ۔ میں پہلے خیال کیا کرتا تھا کہ امر
بالمعروف تسلیم کے منافی ہے ۔ پس میں نے ہاتف کو سنا کہ خدا کی طرف سے
کہہ رہا تھا کہ جب تو حقیقت حال کو صرف میری طرف سے دیکھے تو تسلیم کر
اور جھگڑا نہ کر ۔ اور میرے غیر کی طرف سے دیکھے تو جو میرے امر کی مخالفت
کرتا ہے اس پر اعتراض کر ۔ اور مخالفت کر ۔ اس قسم کی محویت بعض وقت
ایسی ہوتی ہے کہ کوئی کام مخلوق کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا ہے اور فقیہہ
خیال کرتا ہے کہ ایسا شخص جبری ہے ۔ حالانکہ اس میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے ۔
بلکہ انکشاف حقیقت حال ہے جس کو صاحب ذوق ہی دیکھتا ہے دوسرے
کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی ۔ اور وہ اپنے ذوق سے باز نہیں آسکتا ۔ اگرچہ
سینکڑوں دلائل اس کے برخلاف دیئے جائیں ۔ کیونکہ یہ امر ذوق سے علاقہ
رکھتا ہے استدلال کا گھوڑا اس میدان میں لنگ ہے ؎

پائے استدلالیاں چوبین بود
پائے چوبین سخت بے تمکین بود

کامل اگرچہ ہر چیز کا فاعل خدا کو ہی سمجھتا ہے۔ لیکن وقوع فعل کی نسبت مخلوق کی طرف کرتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو تجھے ادب اختیار کرنا چاہیئے اور جب تو کسی کو نصیحت کرے اور بُرے کاموں سے روکے تو تجھے اُس وقت یہ خیال کرنا چاہیئے کہ تیرے دل میں کسی قسم کا فخر نہ چاہیئے اور خود کو اُس سے بہتر نہ سمجھے۔ ممکن ہے کہ وہ تجھ سے بہتر ہو جائے۔ اور شاید اُس کا منکرات ومنہیات میں مبتلا ہونا ہی اُس کی ترقی کا سبب ہو جائے کیونکہ وہ اس حالت میں اپنے نفس کی حقارت کرتا ہے اور اُس سے کسی قسم کے تکبر و تملق کا دعویٰ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو آپ کو عاصی خیال کرتا ہے وہ دعویٰ نہیں کیا کرتا۔ دعویٰ وہی کیا کرتے ہیں جو خود کو مطیع و زاہد خیال کرتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ جو کچھ خدا کے بندوں کی زبان سے بطور نصیحت و پند ظاہر ہوتا ہے اگرچہ وہ محض خیر و راست ہوتا ہے لیکن مخاطبین اپنی اپنی استعداد و قابلیت کے موافق اُس سے نتیجہ نکالتے ہیں۔ جس کا باطن کدورتوں سے صاف ہوتا ہے اور مادۂ قبولیت کے لائق ہوتا ہے اُس کے حق میں وہ سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ اور نورٌ علیٰ نور ہوتی ہے۔ اور جو بندۂ نفس ہوتا ہے اُس کے حق میں وہی کلام زہر کا کام کرتا ہے اور اس کے واسطے تاریکی پر تاریکی بڑھاتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک برتن سے وہی چیز نکلتی ہے جو اُس میں ہوتی ہے چنانچہ آیات ذیل سے بھی یہی مضمون ظاہر ہوتا ہے (فَاَمَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ

---

[1] ایمان والوں کا تو آیات قرآنی کے تماشے سے یقین زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن بے ایمان والے اسی کلام کے سننے سے کفر و سرکشی و پلیدی پر زیادہ ہو جاتے ہیں اور کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں۔

قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ۔
پس جب یہ معلوم ہو گیا کہ محو و اثبات و تبدیل و تحویل ہر لحظہ ہوتی رہتی ہے تو ناصح
کو چاہیئے کہ اپنے کلام کا مخاطب کوئی خاص فرد نہ بنائے۔ بلکہ عمومیت کے طور پر
محض افعال پسندیدہ و ناپسندیدہ کا ذکر کرے۔ جیسا کہ رسول اللہؐ اپنے
وعظ میں کہا کرتے تھے "کیا حال ہو گا اُن لوگوں کا جو ایسا ایسا کرتے ہیں" اور
کسی فاعل کی تعیین نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ ہر لحظہ تبدیل و تحویل کو مشاہدہ
کرتے تھے۔ نیز اس نیت سے وعظ کرے کہ جس میں وہ وساوس نفسانیہ
وخیالات ظلمانیہ ہوں۔ وہ خود ہی اُس سے متنبہ ہو کر اُن کے علاج میں
مصروف ہو جاوے اور تجھے دلالت علی الخیر کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔
اگر سامعین میں سے کوئی بھی تیرے وعظ کے مضمون کا مصداق نہ ہو تو بھی تجھے
(التحذیر قبل الوقوع) (گناہ میں مبتلا ہونے سے پہلے ڈرا دینا) کا درجہ
حاصل ہو جائے گا۔ جب تو کسی کو نصیحت کرے اور تیری نصیحت سے
کوئی راہ راست پر نہ آئے اور تیرے واسطے سے کوئی خدا کی طرف رجوع
نہ لاوے تو اس سے غمناک نہ ہو بلکہ خوش ہو تا کہ لوگوں کا بلا وساطت تیرے
کلام کے خدا کی طرف رجوع لانا بہ نسبت تیرے کلام کے ذریعہ کے تیرے
نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو جاوے۔ کیونکہ اس صورت میں تو نفسانی جذبات
سے سلامت رہے گا۔ فقیر کو چاہیئے کہ ناصح کی نصیحت سے متغیر و ناراض نہ
ہو کیونکہ اُس نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے۔ اور اپنے علم و مقام کے
موافق تجھے نصیحت کی ہے۔ اگر اُس نے جو کچھ تیرے حق میں کہا ہے حق ہے
تو تیرا متغیر ہونا حماقت ہے۔ ورنہ اُس نے تجھے پہلے ہی متنبہ کر دیا ہے۔
کیونکہ انسان جب تک زندہ ہے معرض زوال و ترقی میں ہے۔ علاوہ ازیں

کے اگر تو صاحب ذوق ہے تو اُس کے احسان کا شکر کرنا چاہیئے۔ اور اس کے اعتراض کو ٹھنڈے دل سے سُننا چاہیئے۔ اور اُس کے اعتراض کو ایسا سمجھنا چاہیئے جیسا کوئی عوام الناس لذت و ذوق سے عاری کسی فقیر صاحب ذوق پر اعتراض کرتا ہے جس طرح وہ فقیر اس پر متغیر نہیں ہوتا اور سختی وگرمجوشی سے اُس کا مقابلہ نہیں کرتا اسی طرح تجھ کو بھی ناصح کی نصیحت سے خفا نہیں ہونا چاہیئے اور اس کے اعتراض کو آہستی و نرمی سے سننا چاہیئے اور اُس کے کلام کی تردید میں مشغول ہونا محض حماقت وجہالت وغرور ہے کیونکہ فقیر کا کام ہے کہ ایسے شخص پر بھی متغیر وخفا نہ ہو جو نا واجب اُس کی مذمت کرتا ہے چہ جائیکہ واعظ شفیق وناصح رفیق کی بھولے بھالے کلام کی برداشت نہ کرے۔

دیگر علامت اُس کی یہ ہے کہ صفات ناقصہ کی طرف منسوب کیا جانے سے خوش ہوتا ہے اور اللہ کے قول:۔ (ما اصابك من حسنة عن اللہ وما اصابك من سئیة فمن نفسك) پر عمل کرتا ہے اور مدح وثنا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ صفات کمال کے لائق ذات خداوندی ہے اس واسطے وہ سمجھتا ہے کہ بندہ کے واسطے نقائص وعیوب سے ہی موصوف ہونا شایاں ہے اور صفات کمالیہ کا خواہاں ہونا اصل کے برخلاف ہے اس قسم کے لوگ شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔ ایک عارف کی ابلیس سے ملاقات ہوئی۔ ابلیس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ تمام نقائص وعیوب میری طرف منسوب کئے جائیں اور نہیں چاہتا کہ کوئی بدی وبرائی خدا کی طرف لگائی جاوے پس خیال کا مقام ہے کہ جب شیطان خدا کا اتنا ادب کرتا ہے تو فقیر کو کیونکر ہونا چاہیئے۔

دیگر علامت اُس کی یہ ہے کہ تمام امور میں اللہ کے ارادہ کو تسلیم
کرتا ہے اور باوجود اس کے مخالفت شرع کے وقت لوگوں پر اعتراض کرتا
ہے اور اس کو تسلیم کے منافی نہیں سمجھتا۔ پس وہ اللہ کے ہر ایک کام پر جو وہ
اپنی مخلوق میں کر رہا ہے راضی رہتا ہے اور سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور دیکھتا ہے
کہ اُن کی ڈور اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اور پھر باعتبار ادب شریعت کی مخالفت
شرع کی حالت میں لوگوں سے جھگڑتا بھی ہے اسی واسطے انبیاء بھی کفار سے
جہاد کرتے تھے حالانکہ جانتے تھے کہ اُن کا کفر اللہ کے ارادہ کے ماتحت ہے،
لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے ساتھ جہاد کرنا بھی اسی کی قضاء و قدر و حکم
لم یزلی و تقدیر سرمدی سے ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس نے بہائم پر
رحم کرنے کا حکم دیا ہے اُسی نے اُن کے ذبح کا حکم دیا ہے۔ ع

کہ مردم زیرِ امرِ کردگار اند

ناصح کے حق میں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ جو کچھ جہان میں ہو رہا ہے اللہ
کے ارادۂ سابقہ سے ہو رہا ہے۔ پھر تمہارے وعظ و نصیحت سے کیا فائدہ
کیونکہ اگر یہ دلیل قبول کی جائے گی تو سب ادیان مساوی ہو جائیں گے اور
جو مساوات کا معتقد ہے وہ اجماع کے مخالف ہے۔ میں نے اس خیال
سے اس واسطے منع کیا ہے کہ اکثر اوقات ایسے ایسے اعتراض واعظین و مصلحین
پر کیئے جاتے ہیں اور معترضین خیال کرتے ہیں کہ ہم راہِ راست پر ہیں۔ حالانکہ
یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ غالباً یہ اعتراض ایسے لوگوں سے ہوا کرتے ہیں جو
اپنے خیال میں صوفیائے کرام کے طریق کے متبع ہوتے ہیں۔ مگر کسی کامل
شیخ کی صحبت سے مستفید نہیں ہوئے ہوتے۔ جو کہ اس طریق سے بخوبی
واقف ہو۔ اور ان کے خیالات کی اصلاح کرے

خاتمہ عبودیت کے بیان میں جس کے سامنے سالکوں کے تمام مراتب و مقامات ہیچ ہیں

جاننا چاہیئے کہ خالص عبودیت کے مقابلہ میں تمام مقامات و محلات و مدارج و مراتب و منازل و مراحل ہیچ ہیں۔ اسی واسطے عارفان کامل و عابدان قابل اعمال پسندیدہ و افعال ناپسندیدہ و اوصاف صالحہ و اخلاق طالحہ سے چنداں امید و خوف نہیں کرتے ہیں کیونکہ اعمال صالحہ امراض کا علاج ہیں اور جو مقام عبودیت میں پہنچ گیا ہے اور ذلت و انکساری تمام احوال میں ظاہر و باطن اس کا شیوہ ہو گیا ہے وہ تندرست ہے اور تندرست کو علاج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنے سے اعلےٰ کمال کو بھی اللہ تعالیٰ کے جلال کے مقابلہ میں نقص خیال کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ہرگز کسی ثواب کا مستحق نہیں سمجھتا اور نفس اس کا تمام لذائذ نفسانی و حظوظ نفسانی سے مردہ ہو جاتا ہے۔ ہاں جس کا نفس ڈنک مارنے والا سانپ ہے۔ اس کا علاج فرزندی ہے۔ دیکھو عبودیت کی برکت اور اس کے قرب کو کہ جبکہ بندہ جب اپنے وصف اور ذلت و عجز و تواضع و انکسار وغیرہ اوصاف عبودیت کو جان لیتا ہے تو صفات خداوندی اور صفات مخلوق میں تمیز کرتا ہے اور خدا کی صفات کبریائی و بزرگی و عظمت وغیرہ کو چھوڑ دیتا ہے بلکہ ترک کر کے محنت و مشقت سے خدا کی پسندیدہ اوصاف پسندیدہ

کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ اور وہ اپنے دل سے تمام کمالات کا خیال محو کر دیتا
ہے اور کسی قسم کا عیب و نقصان اُس کے باطن میں راہ نہیں پاتا۔ کیونکہ عیوب
و نقائص اُسی وقت انسان کے دل میں گزر پاتے ہیں جب کہ وہ اپنے کو
کامل و لائق سمجھتا ہو۔ اور عبد کا یہی حق ہے کہ وہ آقا پر اپنا کوئی حق نہ
سمجھے۔ اگر تکالیف شرعیہ کے راز کو سوچا جاوے تو معلوم ہوگا کہ اُن سے
مقصود یہی ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو جاوے کہ وہ ہر ایک پہلو سے
عبد مطلق ہے۔ اُس میں ربوبیت و الوہیت کی بو نہیں۔ اور وہ ہر امر
میں خدا سے پیچھے ہے۔ مثلاً نماز کے مشروع ہونے کا یہی مطلب ہے
کہ وہ اپنے بندے کا نام مصلّی یعنی پیچھے ہٹنے والا رکھے اور اس کو معلوم ہو
کہ میں محکوم ہوں اور تکبر و خود پسندی وغیرہ صفات خداوندی میری
شان کے لائق نہیں۔ میرا کام محض ادب بجا لانا اور اس کے حکم کے سامنے
سر جھکانا اور اپنے کو ذلیل و رسوا بنانا ہے۔ دیکھو کہ شیطان باوجود
حجت قوی و دلیل محکم رکھنے کے بارگاہِ خداوندی سے بباعث تکبر و
بے ادبی راندہ گیا۔ اُس نے کہا تھا کہ اے بار خدایا جب تیرا ارادہ نہیں
ہے کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ تو تو مجھے سجدہ کے واسطے کیونکر حکم دیتا
ہے۔ اگر تیرا ارادہ ہوتا تو میری کیا مجال تھی کہ میں سجدہ نہ کرتا۔ خدا نے
کہا کہ تجھ کو میرا ارادہ تیرے انکار کے بعد معلوم ہوا یا پہلے۔ جواب دیا
انکار کے بعد میں نے معلوم کیا کہ اگر تیرا ارادہ مجھ سے سجدہ کروانے کا ہوتا
تو میں ضرور سجدہ کرتا۔ خدا نے کہا کہ بس اسی بے ادبی کے واسطے تو ماخوذ
ہوا ہے۔ نہ بباعث عدم سجدہ کے۔ آدم علیہ السلام کے کمال ادب کو
دیکھو کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ

مِنَ الْخٰسِرِیْنَ؁) کس طرح اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں۔ باوجودیکہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا ہے اُس کے ارادہ ومشیت سے ہی ہوا ہے۔ پس دیکھو کہ اللہ نے بھی ان کو اس ادب کی خاطر اپنا برگزیدہ بندہ بنالیا۔ اور اس کی خطا کو معاف کردیا۔ اور اپنا برگزیدہ بندہ بنالیا۔ دیکھو یہ ہے عبودیت۔ گویا عبودیت کا سارا دارومدار ادب و فرمانبرداری پر ہی ہے۔ اسی واسطے اس طائفہ نے شریعت کے معنی عبودیت کا اختیار کرنا ہی لئے ہیں۔ کیونکہ بندہ ہر وقت و ہر حالت میں محکوم علیہ و تابع فرمان ہے۔ اسی واسطے شریعت کا حکم اُسے بذات خود سر اٹھانے نہیں دیتا گویا اس کی ہر ایک حرکت اور سکون میں شرع کا حکم موجود ہے۔ جس کی تابعداری اس کا کام ہے۔ پس تقرب الی اللہ کے واسطے راہِ عبودیت سے زیادہ کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ راہ عبودیت محض عجز و انکسار و خضوع و خشوع و تواضع و فروتنی و کم بینی و نفس کُشی کا راستہ ہے۔ اور بندہ کے واسطے عزت و شوکت و تکبر و جلالت۔ خودپسندی و خودنمائی و خودی و خودغرضی اصل کے برخلاف ہے۔ لیکن اس حالت میں ہی اُس پر اسم عبودیت صادق آئیگا خواہ فرمانبردار ہو یا مغرور بے فرمان۔ کیونکہ مغرور غلام سے آزاد نہیں ہوجاتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی جہالت سے لوازم عبودیت (مثلاً آقا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اُس کے احکام کا بجالانا اور منہیات سے باز رہنا) سے خارج ہوجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبدِ مطلق دو حال

؁ اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر تو نہ بخشتا اور رحم نہ کرتا تو ہم گھاٹے پانے والوں سے ہوتے۔

سے خالی نہیں۔ یا تو اپنی قدر و قیمت وحقیقت کو جانتا ہوگا۔ اس صورت میں تو انکسار و تواضع و تسلیم و خضوع وغیرہ بجا لائیگا۔ یا اپنی حقیقت سے غافل ہوگا اور سرداری کے مقام کا دم مارے گا۔ اس حالت میں اُس پر خود پسندی وخود نمائی و عُجب و تکبّر ظاہر ہوگا۔ لیکن پھر بھی مطلق عبودیت سے خارج نہیں ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ قُرب کے اندازہ سے خُدا کا خوف ہوتا ہے۔ جس قدر بندہ قرب میں زیادہ ہوگا۔ خوف و ادب میں اُسی قدر بہ نسبت دوسرے کے زیادہ ہوگا۔ اس درجہ میں اُس کا کام عاجزی کی حد پر ٹھہر جانا اور دعاوی کا ترک کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ دعاوی سے الوہیت کی طرف مائل ہونے کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اسی واسطے عارفوں کے دل سے ایک لحظہ بھی خوف جُدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہیں ہر لحظہ تحویل و تبدیل کا ڈر لگا رہتا ہے اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں خدا کسی امر کا مقید نہیں ہے۔ لَا رَادَّ لِحُکْمِہٖ وَلَا مَانِعَ لِقَضَائِہٖ۔ کوئی اُس کے حکم کو رد نہیں کر سکتا اور کوئی اُس کے حکم کو ٹال نہیں سکتا۔ اس واسطے اُن پر ہمیشہ خوف کا دروازہ کھلا رہتا ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ سعادت و شقاوت کا حکم جاری ہو چکا ہے۔ سعید اپنے ماں کے پیٹ میں ہی سعید ہے۔ اور شقی (بدبخت) اپنی ماں کے پیٹ میں ہی بدبخت ہوتا ہے۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہؐ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا عمل کئے جاؤ ہر ایک کے لئے وہی آسان ہوگا۔ جس کے واسطے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر ایک امر ایسا ہی دفعتہً میں آتا ہے۔ جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہوتا ہے اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خیر و شر و سعادت و شقاوت کے واسطے اسباب ہیں اور ہر ہر چیز کے اسباب اپنے اپنے محل پر موجود ہو جاتے ہیں اور خیر کے راستہ پر چلنا

خوشخبری و سعادت کی علامت ہے۔ پس انسان کو اپنے اعمال کے واسطے
اپنے دل میں دیکھنا چاہیئے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے یا نہیں۔ اگر زبان
و دل موافق ہوں تو سعادت کی امید رکھنی چاہیئے۔ اور اگر ظاہر کیا خیر معلوم
ہو اور باطن میں شک و اضطراب و شرارت ہو تو جاننا چاہیئے کہ تیرا دل
نور ایمان سے منور نہیں ہے تجھے اپنے حال پر رونا چاہیئے اور جان لینا
چاہیئے کہ تیرے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ تیرے دل کی میزان
ہے اور تیرا دل خوب جانتا ہے اور جو کچھ اس میں خواطر اور وساوس گزرتے
ہیں اُن سے بخوبی واقف ہے اسی واسطے حدیث میں ہے کہ ایک بندہ
اہل جنت کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ دوزخ میں گر جاتا ہے
یعنی ظاہر میں لوگوں کی نظر میں وہ اچھے ہوتے ہیں لیکن اُن کے دل کی حالت
و نیت خراب ہوتی ہے۔ جس سے خدا کی نظر میں وہ اعمال دوزخ کے لائق
ہوتے ہیں جس سے وہ دوزخ میں جا گرتا ہے اور ایک بندہ دوزخیوں کے
سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ بہشت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یعنی ظاہر
میں جو وہ کام کرتا ہے لوگوں کو خلاف شرع معلوم ہوتا ہے۔ لیکن باطن میں
اس کے دل کی حالت اور نیت درست ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ کو وہ بات
معلوم ہوتی ہے جو لوگوں کو نہیں ہوتی۔ گویا اس حدیث میں رسول اللہ نے
لوگوں کے دل کی حالت ظاہر فرمائی ہے۔ فافہم وتفکر۔

جاننا چاہیئے کہ عبد کی کوششوں و ریاضتوں کی غنت غائی اپنے آقا
کی معرفت ہے۔ لیکن اس کی معرفت کما حقہا دنیا وعقبیٰ کی ترقی کے ساتھ بھی
ممکن نہیں ہے عارفوں کی عمریں گزر جاتی ہیں اور وہ پھر بھی پہلے ہی قدم پر
ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی ہمتیں اور کوششیں حقوق حق کی اقامت میں ڈٹی

رہتی ہیں۔ اسی واسطے رسول اللہؐ نے فرمایا ہے "سُبْحَانَكَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ سُبْحَانَكَ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ سُبْحَانَكَ وَلَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ"[1] واہ سبحان اللہ آپ کس درجہ کے معلم خیر ہیں اور کس رتبہ کے عبد ہیں۔ جب تو یہ راز جان چکا تو کسی مقام کی تلاش میں مضطرب نہ ہو۔ کیونکہ تو ہر حال میں خدا کے ساتھ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کے ساتھ ہے۔ نسبت علو وسفل وہاں برابر ہے گویا وہ ہر ایک درجات و درکات میں اپنے بندوں کے ساتھ ہے ایسی معیت کے ساتھ جو اُس کے جلال کے شایان ہے۔ پس تجھ کو لازم ہے کہ تو اپنے تمام حالات (ادنیٰ و اعلیٰ، پست و بلند، عزت و ذلت) میں راضی رہے کیونکہ خدا کی اُس حالت میں تیرے ساتھ ہے۔ پس تو بھی اس حالت میں اُس کے ساتھ رہ کیونکہ تو تو اُس کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہے پس اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ بھی باعتبار معیت ادنیٰ درجہ کے برابر ہے یا اسی واسطے ہم کو ہر حالت میں خوش رہنا چاہیئے کہ ہم نہ اعلیٰ حالت میں ہیں نہ ادنیٰ درجے میں مقت و غضب سے مامون و مصئون ہیں۔ کیونکہ محو و اثبات و تبدیل و تحویل رات دن واقع ہو رہی ہے۔ سوائے انبیاء کے کسی کو محو و اثبات سے امان نہیں۔ پس جو شخص خدا سے ملنا چاہے وہ ہمیشہ عجز و انکسار و تواضع و فروتنی اختیار کرے اور ہر ایک چیز میں آپ کو اللہ تعالیٰ غنی حمید کا محتاج

---

[1] تیری ذات پاک ہے ہم نے تیری کماحقہ عبادت نہیں کی۔ تو پاک ہے ہم نے تجھے پورا شناخت نہیں لیا۔ تو پاک ہے ہم تیری تعریف سے قاصر ہیں۔ تو ویسا ہی ہے جیسا تو خود اپنی تعریف کرتا ہے۔

سمجھے۔ اور دنیا و آخرت کے حظوظ و خواہشات پر دل نہ لگائے۔ اور کسی
مرتبے و مقام کا دلدادہ نہ ہو۔ کیونکہ مراتب و مقامات پر دل لگانے سے
وہ اُن کا ہو جائے گا نہ اللہ کا۔ اُس کا تو وہی ہوگا جو اُسی کا ہو رہے گا۔ اور کسی
درجہ و مقام کا طالب نہ ہوگا۔ اور دنیا و آخرت میں مستور ہوگا۔ اسی واسطے محققوں
نے کہا ہے کہ ولی وہ ہے جو مراتب دنیاوی و اعزاز اخروی کا طالب نہ ہو
اور دنیا میں مستور و محجوب رہے۔ البتہ دنیا میں مشہور ہونا انبیاء کا خاصہ ہے۔
کیونکہ وہ اسی امر کے واسطے مرسل و مامور ہوتے ہیں۔ لیکن اولیاء کا وظیفہ
وکام محض عبودیت و عدم شہرت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عبد مطلق کا اعلےٰ رتبہ
یہ ہے کہ کسی مرتبہ و مقام کا طالب نہ ہو۔ کیونکہ مقامات کی تلاش کے وقت
مردان کا محتاج و محکوم ہوگا۔ لیکن مرد ایسا ہونا چاہیئے کہ نہ مقامات کا حاکم
ہو نہ محکوم۔ علاوہ اس کے طالبان مقامات کی ہمت اسی میں منحصر رہے گی
کہ وہ کسی غایت و نہایت مرتبے و مقام تک پہنچیں۔ لیکن جب کہ مقامات غیر
محصور و لامتناہی ہیں۔ پس جب وہ ایک مقام و درجہ تک پہنچیں گے۔ تو نئے
درجے کی خواہش دل میں پیدا ہوگی اور یہ غایت جس پر وہ پہنچیں گے نئے مقام
کی ابتداء ہوگی۔ گویا وہ ہمیشہ غایات و مقامات کے محتاج و محکوم رہینگے
اور یہ میدان کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لیکن عبد کامل ان غایات و مقامات کے
محتاج و محکوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حق محدود نہیں ہے اور
نفس الامر میں اُس کی کوئی غایت و حد نہیں ہے اور اس کے واسطے کوئی مقام
متعین نہیں ہے۔ اسی واسطے قطب محمدی کہا کرتے تھے کہ مجھ میں اور غیر
میں صرف یہ فرق ہے کہ میرے واسطے کوئی مقام متعین نہیں ہے اور مقامات
کو میرے ساتھ وہ نسبت ہے جو اسماء الٰہیہ کو اللہ کے ساتھ ہے۔ پس جیسا

وہ کسی مقام میں متعین نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر نفس و ہر زماں و ہر حال میں ایسی صورت سے ہوتا ہے جیسا وہ نفس اور وہ زمان اور وہ حال تقاضا کرتا ہے۔ پس وہ کسی خاص صورت و حال کا مقید نہیں ہے۔ کیونکہ احکام الٰہیہ ہر حال میں و ہر زماں میں مختلف ہوتے رہتے ہیں اور اُن کے اختلاف سے وہ بھی ہر رنگ میں ہوتا ہے کیونکہ (کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ) اُس کی شان ہے پس ایسا ہی محمدی ہے۔

اب ہم سالکین کے چند مقامات و احوال کو جو عبودیت کے درجہ سے ساقط ہوتے ہیں لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جاوے کہ عبودیت ہی مقصود بالذات و مطلوب فی نفسہٖ ہے اور وہی سب سے نزدیک راستہ ہے اور وہی انبیاء و صدیقین کا خاص مرتبہ ہے۔ اسی واسطے رسول اللہ ؐ کو جب اختیار دیا گیا کہ آپ بادشاہ نبی ہونا چاہتے ہیں یا بندہ نبی تو آپ نے عبودیت کو اختیار کیا۔ اور آپ کے قول (انا سید ولد آدم ولا فخر) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور یہ فخر کی بات نہیں ہے) کے یہ معنے ہیں کہ میں سیادہ و سرداری پر فخر نہیں کرتا بلکہ عبودیت میرے لئے فخر ہے۔ اسی عبودیت کے لئے ایجاد موجودات ہوئی۔ جیسا کہ (ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون)[1] سے ثابت ہوتا ہے۔ آپ کا عبودیت پر فخر کرنا (باوجودیکہ آپ جانتے تھے کہ وہ قیامت کے روز شفاعت عظمیٰ کے مالک ہوں گے۔ اور باقی تمام انبیاء اس مقام میں شفاعت سے انکار کریں گے) اس غرض سے ہے کہ امت کو عبودیت کی عظمت معلوم ہو جائے۔ تاکہ وہ سب سے پہلے

---

[1] جن و انسان کی پیدائش محض عبودیت کے لئے ہوئی ہے۔

عبودیت کی طرف سبقت کریں۔ جاننا چاہیئے کہ عبودیت کی روح تو یہی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ خیال کرے۔ لیکن تقرب کی حالت میں عبودیت بذات خود قائم نہیں رہتی۔ کیونکہ صفات عبودیت اور صفات سیادت باہم متخالف و متناقض ہیں اور وصل و قرب اتحاد کو چاہتا ہے اسی واسطے وصل کی حالت میں صفات متناقضہ جمع نہیں ہو سکتیں اور ذلت و عجز ہو سیادت کے رتبہ کے منافی ہے جاتی رہتی ہیں۔ اسی واسطے جب ابویزید بسطامیؒ قرب و وصل کے حصول میں حیران ہوئے۔ اور نہ جانا کہ کس چیز سے وصل حق حاصل ہوتا ہے۔ تو اُسے خدا نے کہا کیا تو ایسی چیز سے میرا وصل و قرب چاہتا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ یعنی انکسار و افتخار سے۔ میں اس سے حاصل نہیں ہونے کا۔ پس ابویزیدؒ نے ذل افتقار کو اپنے نفس سے دور کیا اور قرب حق حاصل کیا۔ کیونکہ وصل کے واسطے وہ صفات مانع تھیں۔ فافہم فانہٗ دقیقٌ و نفیسٌ۔

اگرچہ واقع میں یہی ہے کہ عبد اصالتاً اسی واسطے پیدا کیا گیا ہے کہ اللہ کا بندہ ہو اور ہمیشہ بندہ رہے لیکن جب اللہ اس کو سیادت و سروری کی خلعت پہنا دیتا ہے اور اس کے اظہار کی اُسے اجازت دیتا ہے تو وہ دیکھنے والے کے نزدیک سردار ہوتا ہے اور فی نفسہٖ عبد ہوتا ہے۔ گویا عبد باعتبار اپنی ذات کے ہوتا ہے اور آقا بلحاظ صفات خداوندی کے اور وہ سیادت اس پر خدا کی زینت و خلعت ہوتی ہے۔ ابویزید بسطامیؒ کے لوگ ہاتھ چومتے اور ان سے تبرک ڈھونڈتے اور عجز و انکساری سے پیش آتے۔ کسی نے ان سے سوال کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے انہوں نے جواب دیا کہ میری تعظیم نہیں کرتے اور میرے لباس سے تبرک نہیں ڈھونڈتے

بلکہ اللہ کے لباس سے مسخ کرتے ہیں۔ جو اس نے مجھے پہنایا۔ کیا میں ان کو اس سے منع کر دوں۔ کیا وہ کسی غیر کا ہے۔ یہ بھی سمجھ رکھ کہ تیری صفات تیرے آقا کی صفات میں سے نہیں ہیں۔ پس تجھے دعویٰ سے خاموش رہنا چاہیئے اور جاننا چاہیئے کہ حالت عبودیت بہ التزام ذل و عجز و انکسار ہی ہے۔ اور یہی تیرے واسطے باعث فخر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک عارف بڑے تکبر و فخر سے اترا کر چلا کرتا تھا۔ جیسا کہ مغرور و خود پسند چلا کرتے ہیں۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی۔ کہا کہ کیوں نہ فخر کروں اور کیونکر نہ اکڑ کر چلوں (حالانکہ) میں محض عبد خالص ہو گیا ہوں اور اپنے میں ربوبیت کی بو بھی نہیں پاتا ہوں کیا یہ خوشی کا مقام نہیں ہے۔ کیا یہ فخر کا وقت نہیں ہے۔ مگر یہ مشکل مقام ہے۔ ہر زمانے میں ایک آدمی ایسا ہوتا ہے جو اس مرتبہ تک پہنچتا ہے۔ ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں درجہ عبودیت نصیب کرے اور اس کی ملاقات کے زمانے تک کوئی امر ہم میں اور اس کی عبودیت میں مانع و حائل نہ ہو۔

ان احوال میں سے ایک حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اسے یہ رتبہ حاصل ہوتا ہے تو سوا اللہ کے تمام اشیاء سے توبہ کرتا ہے اور صرف اسی کو کارساز سمجھتا ہے اور (ان لا تتخذ من دونہ وکیلا) (تو اس کے سوا کسی کو کارساز نہ بنائے) کو اپنا دستور العمل بناتا ہے۔ شبلیؒ کا قول ہے کہ توبہ کی تعریف یہ ہے کہ تو اللہ کے سوا ہر دو جہان میں کسی کو نہ دیکھے الا کل شیئ ما خلا اللہ باطل اللہ کے سوا ہر ایک چیز باطل و فانی ہے۔ دیگر حالات عبودیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ملکوت السموات والارض میں غور و فکر کرتا ہے اور ان میں ذات حق کا مشاہدہ کرتا ہے کیونکہ یہ ایسی حالت کی تلاش ہے جو ہمیشہ ذات حق کے ساتھ ہے اور بندہ کا کام یہ ہے

کہ وہ اپنے آقا کو ہر مکان میں بلامکان دیکھتا ہے۔ پس وہ ہمیشہ اپنے آقا کے سامنے کھڑا رہتا ہے اور اُس سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا نہ زبان سے نہ دل سے۔ مگر محض عبودیت کی وجہ سے دیدے تو کچھ خوشی نہیں۔ نہ ملے تو کچھ شکایت نہیں۔ گویا اُس کے نزدیک عطا و منع وسعادت وشقاوت یکساں ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں۔ کیونکہ اگر اُس کے نزدیک عطا کو منع پر اور سعادت کو شقاوت پر ترجیح ہو تو اُس میں خواہش نفسانی و حظ نفس پایا جاتا ہے۔ نیز اس میں اللہ پر تحکم (حکم چلانا) پایا جاوے گا۔ لیکن اس حقیقت کو صاحب ذوق معلوم کر سکتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ سے شے معین کی درخواست کرتے ہیں۔ پھر جب وہ معین چیز حاصل ہوجاتی ہے تو اُس معین چیز پر پشیمان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کاش ہم سوال ہی نہ کرتے اور معین بھی نہ کرتے۔ اور یہ اکثر واقع ہورہا ہے۔ مثلاً ایک شخص چاہتا ہے کہ وہ شیخ ہو جائے۔ پھر جب اس کو مشیخت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ بلاؤں میں مبتلا ہوتا ہے۔ پھر اس وقت چاہتا ہے کہ کاش مجھے یہ حالت ہی معلوم نہ ہوتی۔ یا ایک فقیر خواہش کرتا ہے کہ اللہ اُسے مال دیوے۔ پھر جب اُسے مال مل جاتا ہے تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اور نیک کاموں سے اندھا ہو جاتا ہے۔ پھر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے مبارک ہیں وہ فقیر جو ہر حال میں راضی ہیں۔ اور دنیا کی پرواہ نہیں کرتے۔

یہ بھی یاد رہے کہ جو اللہ کے ساتھ مبتلا ہے وہ بہ نسبت اپنے نفس کے ساتھ مبتلا ہونے کے آرام و آسائش میں ہے۔ چنانچہ بعض عارفوں نے کہا ہے کہ جب تک کسی کے دل میں کسی حالت کی خواہش باقی رہے یہاں تک کہ حق کی طلب بھی وہ ولی نہیں ہے۔ کیونکہ ذات حق کی تلاش حق کے واسطے

ممکن نہیں ہے۔ بلکہ وہ بھی حظ کے واسطے ہوتی ہے کیونکہ تلاش کا فائدہ مطلوب کی تحصیل ہوتی ہے اور ذات حق حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ مجہول نہیں ہے اسی واسطے وہ مطلوب نہیں ہو سکتی۔ پس معلوم ہوا کہ تلاش حق بھی حظ نفس کے واسطے ہو سکتی ہے۔ نہ حق کے واسطے۔ فافہم ہذا المقام فانہ دقیقٌ رقیقٌ وعجیبٌ غریبٌ۔

پس عبد کو چاہیئے کہ ایسے فکر و غور سے پرہیز کرے جس کے واسطے مامور نہیں ہے۔ کیونکہ اُس میں ذات حق کی طلب ہے اور یہ محال ہے جیسا کہ اوپر مدلل مذکور ہوا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عقول سے بھی ایسا ہی مستور ہے جیسا کہ آنکھوں سے محجوب ہے یعنی عقل سے بھی ذات خداوندی حاصل نہیں ہو سکتی اور ملاء اعلیٰ بھی اُس کو ایسا ہی تلاش کرتے ہیں جیسا تم تلاش کرتے ہو۔ پس تلاش میں ہم ملاء اعلیٰ یکساں شریک ہیں لیکن کیفیت تلاش میں مختلف ہیں۔ بعض ہم سے اُس کو عقل و فکر سے تلاش کرتے ہیں اور بعض اُسکو اُسی سے تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ملاء اعلیٰ اس کو عقل سے تلاش کرتے اور اُن میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کو اس سے ہی تلاش کرے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان اس کی کمال صورت پر پیدا کیا گیا ہے اور فرشتے اُس پر مخلوق نہیں ہیں۔ اسی واسطے انسان کامل طاقت رکھتا ہے کہ اس کو اس کے ذریعہ سے تلاش کر سکے اور جو اُس کو اُس کے ہی ذریعہ سے تلاش کرتا ہے واصل ہو جاتا ہے اور اُس تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ جاننا چاہیئے کہ ذات حق مجہول الکیفیت ہے۔ کسی حد و قید سے محدود و مقید نہیں ورنہ وہ متحیز ہو جاتا اور لیلۃ الاسراء (معراج) میں رسول اللہؐ کا قاب قوسین (دو کمان کی مقدار) کا قرب اور دریا کی قعر میں مچھلی کے پیٹ کے اندر یونسؑ کا قُرب برابر نہ ہوتا۔ اور یہ مضمون حدیث سے ثابت ہے تو معلوم ہوا کہ ذات

خداوندی کسی حدِ معین میں محدود نہیں ہے پس خدا کے نزدیک پست و بلند
و نشیب و فراز یکساں ہے۔ عرش پر ہونا اور تحت الثریٰ (زمین کے اندر)
ہونا برابر ہے۔ اسی واسطے اس کی ذات تفکر کے احاطہ میں نہیں آ سکتی۔ تفکر
اگرچہ ضروری ہے لیکن اپنی ذات کا۔ نہ ذاتِ باری تعالیٰ کا جیسا کہ (وَفِیْٓ
اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ) (اور تو تمہارے اندر ہے کیا تم فکر نہیں کرتے)
سے ظاہر ہوتا ہے اور ذاتِ بحث کی طرف متجاوز نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا
انجام تو حیرت ہے۔ بھلا حادث قدیم کو کیونکر محیط ہو سکتا ہے علاوہ اس
کے تفکر میں مشغول رہنا اور حالت موجودہ معطیہ من اللہ پر شاکر نہ ہونا دو عذابوں
میں گرفتار ہونا ہے۔ نیز فکر و غور کرنے سے تفکر کرنے والا اپنی فکر کی پیدائش
تک پہنچتا ہے نہ ذاتِ باری تک پس ذاتِ پاک میں غور کرنا کسی حالت میں
مفید نہیں۔ اگر غور کرنے والا مومن ہے اور تقلیداً ذاتِ خداوندی پر
ایمان رکھتا ہے اور پھر عقل کو دخل دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ اپنے ایمان میں
شبہ ہے اور اگر مومن نہیں تو اُسے مومن نہ ہونا ہی بس کرتا ہے۔ پس
معلوم ہوا کہ ذاتِ خداوندی عقل و فکر سے مدرک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہر
ایک عقلی دلیل پر شبہ و اعتراض ہو سکتا ہے اسی واسطے عقلا کا اختلاف
رہتا ہے اور ہر ایک فریق اپنے مخالف کی دلیل اعتراض کر سکتا ہے گویا
ہر ایک کی دلیل دوسرے کا مشتبہ ہے گویا اُن کے تمام دلائل عین اعتراض ہیں۔
اور بڑی خرابی تو یہ ہے کہ مخلوق (عقل) کو خالق (حق) پر حاکم بناتے ہیں۔
اور مخلوق کے ذریعہ سے خالق کو جاننا چاہتے ہیں۔ مگر وہ جانا نہیں جاتا۔
حالانکہ شہ رگ سے نزدیک ہے۔ اس کی معرفت اور اس کا ادراک تو
بجز بیان و تمہید کے نہیں ہو سکتا اگر خبر و نقل کے واسطہ سے اُس کی صفت

معلوم نہ ہوتی تو عقل اُس پر دلالت نہ کر سکتی۔ حقیقت میں سمجھو تو وہ ہر وقت
ہمارے ساتھ ہے لیکن اس کی معیت کی کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی اسی واسطے
فرمایا ہے هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں تم ہو) اور
نہیں فرمایا کہ انتم معہ (تم اس کے ساتھ ہو) اس میں حکمت یہی ہے کہ
اُس کی مصاحبت مجہول ہے ہم اُس کی مصاحبت کو نہیں جان سکتے اور وہ
ہماری معیت کو جانتا ہے۔ فافہم وتدبر۔

جاننا چاہیئے کہ ہر ایک فرد اپنی استعداد و لیاقت و مبلغ علم کے مطابق
خدا کو جانتا ہے۔ دو متنفس ایک درجۂ علم میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ دو
شخص ایک ہی درجۂ مزاج پر نہیں ہو سکتے ان اسرار و حِکَم کو اہل اللہ ہی جانتے
ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ باوجود التفکر فی الذات کی ممانعت کے کوئی شخص
تفکر سے بچا ہوا نہیں۔ یہاں تک امام غزالیؒ جیسے فحول بھی نہیں چھوٹے۔ لیکن
عارفوں نے اس کے اقوال کو خطا سمجھا ہے۔ قیامت کے روز وہ پوچھا جائیگا
کیونکہ اس نے اپنی عقل کو ایمان پر ترجیح دی ہے اور علم ذات مطلق میں
اپنی فکر و قیاس کو حاکم بنایا ہے۔ حالانکہ عارف کامل اس مد میں حیران و
سرگرداں ہیں۔ ایسا ہی وہ امام غزالی کے اس قول (کہ وہ جہاں میں نظر و فکر
کے بغیر معلوم ہو سکتا ہے) کو بھی خطا سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی حیرانی کی وجہ یہ ہے
کہ اگر وہ حق کو عالم سے جدا سمجھتے ہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ اور اگر اس کو عین عالم
بتاتے تھا تو بھی نہیں بن سکتے اور پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی واسطے
وہ حیران ہوتے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں گاہے کچھ کہتے ہیں اور کوئی مستقل رائے
قائم نہیں کر سکتے۔ اکثر ان لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے جو معرفت حقیقت ذات
کی تلاش کرتے ہیں۔ وہ اندھی اونٹنی کی طرح ادھر اُدھر ٹکریں مارتے ہیں۔

جہاں نورِ ایمان ہوتا ہے وہاں دلائل سب بھسم ہو جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ
غائت معرفت سے عاجز آنا اور عدمِ ادراک کا اقرار کرنا ہے جیسا کہ ابوبکر صدیقؓ
کا قول ہے کہ خدا نے اپنی معرفت کو ہمارے نفس کی معرفت پر موقوف رکھا ہے
اور اس میں راز یہ ہے کہ جب ہم اپنے ہی نفس کی معرفت سے عاجز ہیں تو اُس
کی معرفت ذات سے بطریق اولیٰ عاجز ہوں گے۔ پس ان مختلف کلاموں سے
معلوم ہوا کہ معرفتِ حق میں عاجز و حیران ہونا ہی عین وصول و ادراک ہے۔
یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بہائم فطرت ہی میں حیرت فی اللہ پر مجبول
ہیں۔ پس سب سے اعلیٰ مرتبہ جس پر صحیح عقل والے اپنے عقل و فکر سے پہنچا چاہتے
ہیں وہ بہائم کا ابتدائی درجہ ہے۔ کیونکہ اہل نظر و صاحب عقل و فکر سے
حیرت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ تنور سے نکلے بھاڑ میں گرے
والا معاملہ ہوتا ہے اور پہلے سے زیادہ حیران ہو جاتے ہیں اور بہائم میں
عقل و فکر نہیں ہے وہ ہمیشہ ہی فطری حیرانی میں رہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ
اللہ کی معرفت ذات میں سب سے زیادہ حیران وہ ہے جس کو اس کا زیادہ
علم ہے اور تلاش ہے۔ چونکہ معرفت ذات حق محال ہے اس واسطے عارفوں
پہ آیت (سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون)[1] بڑی ناامید کرنے والی
اور ہمتیں پست کرنے والی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ لفظ رب العزۃ بتا رہا ہے کہ
اس کی ذات کا دریافت کرنا محال ہے۔ کیونکہ لفظ عزت کے معنی منع و محال کے
ہیں۔ اور اس میں ان لوگوں پر چوٹ ہے جو اسے استدلال و عقل و خیال سے

---

[1] تیرا رب تمہارے خیالات سے بری و پاک ہے۔ ان خیالات و دماغ سے جو لوگ
بیان کرتے ہیں اس کا دریافت کرنا محال ہے۔

دریافت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ عقل مخلوق اپنے خالق پر احاطہ نہیں کر سکتی بلکہ
اس کی معرفت وحی کے کشف وشہود سے ہوتی ہے۔ پس جو شخص خدا کی تعریف
اس طرح کرتا ہے جس طرح اس نے خود نہیں کی وہ معرفت وشناخت میں
قاصر ہیں کیونکہ رب العزۃ کو کوئی وصف نہیں پا سکتی اور وہ کسی وصف میں محدود
نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی حقیقت کسی اسم ولفظ سے تعبیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عزیز
کا مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ کسی لغت ووصف وعلم ومعرفت سے حاصل نہ ہو سکے
ورنہ وہ عزیز ہی نہ ہوگا۔ اسی واسطے آیت مذکور کے بعد خدا نے فرمایا کہ سَلَامٌ
عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ کہ رسول ہی بچے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس کی کسی صفات
میں خوض نہیں کرتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ ہر ایک گروہ دلائل عقلیہ سے اس پر متفق ہے کہ ان کا
کوئی موجد ہے جس سے ان کو وجود حاصل ہوا ہے۔ اور اس پر اس کثرت
سے اتفاق ہے کہ یہ مسئلہ بدیہیات وضروریات سے شمار کیا جا سکتا ہے پس
اگر اسی پر بس کرتے اور اس کی صفات کو اس طرح سے قبول کرتے جیسا کہ
انبیاء کی زبان سے معلوم ہوتے ہیں تو نجات وفلاح پا جاتے۔ لیکن انسان جلد
باز ہے۔ اس کو قوتِ عقل وفکر عطا ہوئی ہے۔ اس نے سمجھا کہ ہر چیز عقل کے
اندر ہے۔ اور یہ خیال نہ کیا کہ عقل کی بھی ایک حد ہے۔ جس سے وہ تجاوز
نہیں کر سکتی اور صفات الٰہیہ کا مسئلہ عقل کی حد سے باہر ہے۔ اسی واسطے
وہ اس میدان میں بھی عقل کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ مگر منہ کی کھائی اور
کچھ حقیقت سمجھ میں نہ آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا علم اللہ کے بتلانے سے
جس کو اس نے انبیاء کی زبان سے ظاہر کیا ہے اور جن کو اولیاء کشف وشہود
مشاہدہ ومکاشفہ سے دیکھتے ہیں۔ حاصل ہو سکتا ہے۔ [illegible] جو ابوبکر صدیق رضی

کا مشہور مقولہ ہے کہ معرفت ذات سے عاجز ہونا ہی ادراک وحصول ہے اس سے
وہی عاجزی وقصور مراد ہے جو کہ عقل وقیاس کے وسیلہ سے ہو نہ کشف وشہود
کے وسیلہ سے کیونکہ اس ذریعہ سے حصول ممکن نہیں۔ اس واسطے کہ وہ راستہ
خود خدا کا بتلایا ہوا ہے۔ اس مقام کو یاد رکھ کہ اس نکتہ کو کسی اور کتاب میں نہیں
پائے گا اس کی تفصیل کے واسطے دفاتر چاہئیں۔ جہاں اس رسالہ میں مقام معرفت
کا ذکر آئے گا وہاں اس مسئلہ کی کچھ مزید تحقیق کی جائے گی۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ
استویٰ کی کیفیت وحقیقت کا سوال مجھ پر کیا گیا۔ پس میں نے عالم خیال میں
عرش اور اس کے اردگرد اطراف وجوانب بلندی وپستی کو دیکھا اور میں اس کے
اندر تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پرندہ سفید رنگ طویل گردن آیا اور عرش
اور اس کے لوازمات کو نگل گیا۔ عرش اور وہ طائر جو اسے کہا گیا تھا اس جو
کے مقابلہ میں جو اس کے چاروں طرف تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا کہ کسی
دریچہ میں ذرہ۔ اگر تو اس کی تفتیش کرنا چاہے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ کتاب
اللہ وسنت شریفہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرش کے اوپر کوئی اور مخلوق ہے
عرش کے اوپر غیر محدود ولا متناہی حد تک کوئی سقف ہے نہ کوئی فلا اور
نہ کوئی ملا اور نہ اس کے پیچھے لامحدود حد تک کوئی ٹھہرنے کی جگہ اور بنیاد
ہے۔ وہ یہ سب کچھ مخلوق ہے اور حیران کرنے والا ہے۔ جب اس کی مخلوق
کی حقیقت سے حیرانی ہوتی ہے۔ تو کیا خالق کی حقیقت آسان ہوگی۔ اور
جب مخلوق غیر متناہی ہے تو کیا خالق غیر متناہی نہ ہوگا تو پھر یہ خیال کیونکر
درست ہو سکتا ہے کہ عرش ذات حق کا مستقر (جائے قرار) ہے۔ سالکوں کا
ایک مقام حزن وغم بھی ہے۔ لیکن عبودیت کے درجہ میں ساقط ہو جاتا ہے
اور حب کامل کسی شے کے فوت ہونے سے غم نہیں کھاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا

ہے کہ کوئی ایسی چیز نقصان نہیں ہوئی ہے کہ جو اُس کی قسمت میں تھی اور پھر فوت ہوگئی ہو۔ بلکہ جو فوت اور نقصان ہوئی وہ اُس کی تقدیر میں ہی نہ تھی تو پھر غم کیسا۔

اور جانتا ہے کہ اگر وہ چیز اُس کے نصیب میں ہوتی تو ہرگز فوت نہ ہوتی کیونکہ جس وقت میں اس پر طاعت لکھی ہوئی ہے اُس سے خالی ہونا ممکن نہیں ہے اور جس وقت اس کے حق میں ضلالت و بدنامی مقدر ہے اس کا ٹلنا ناممکن ہے نیند کے وقت بیداری کا ہونا محال اور بیداری کے وقت نیند کا ہونا معلوم۔ غیر ولی کا ولی کا ہونا مشکل۔ مطیع کا عاصی ہونا محال۔ پس جب ہر حال میں اس کا نصیب اُس کو مل جاتا ہے۔ تو حزن و الم کے کیا معنی۔ ہر وقت اپنے لوازم و شرائط و اسباب و وسائط ساتھ لے کر آتا ہے اور جب جاتا ہے اپنا بوریہ بستر ساتھ لے جاتا ہے اسی واسطے عبد کامل ہر وقت میں خوشحال رہتا ہے۔ ماضی و استقبال اُس کی نظر میں یکساں ہے ہر حال میں زمانہ حال کا نگراں ہوتا ہے نہ ماقبل و مابعد کا۔ کیونکہ وہ ہر حال میں اللہ کو اپنے ساتھ دیکھتا ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو شخص دنیا و آخرت کی کسی چیز پر حزن و غمناک ہوتا ہے اس کا یہ فعل دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے برخلاف واقع ہونے سے خوش تھا اور یہ بے ادبی ہے۔ کیونکہ وہ چیز مانگتا ہے جو جس کے لئے مقسوم نہیں اور خدا کو چھوڑ کر اپنے نفس کا کہا مانتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ رب کی رضا پر راضی ہوتا تو ہر حالت میں جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی خوش رہتا۔ اور اپنے آپ کو تابع حکم ایزدی و مطیع فرمان سرمدی خیال کرتا۔ اس تقریر سے کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ جب کہ ہر ایک نیک و بد اللہ کے ارادہ سے ہے اور کسی کو اُس کی مخالفت کی طاقت نہیں تو عمل

کرنے اور امر بالمعروف کی کیا ضرورت ہے ۔کیونکہ خدا کا ارادہ اور اس کی تقدیر کسی پر ظاہر نہیں ہے ۔کوئی نہیں جانتا کہ میں اللہ کے علم میں سعید ہوں یا شقی ۔اللہ کی تقدیر وقوع فعل اور تدبیر کے بعد معلوم ہوتی ہے ۔اسی واسطے عمل کرنے اور تدبیر کو کام میں لانے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ کسی حال میں منقطع نہیں ہو سکتا جب ہم کسی کو نماز کے واسطے کہتے ہیں ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ۔اگرچہ اُسے عمل اُسی وقت ہوگا جب کہ اللہ کے علم میں اس کے واسطے نماز پڑھنی مقدر ہوگی ۔اگر کسی کو کہا جا دے کہ نماز مت پڑھو اس کی تعمیل اُس سے اگرچہ اس حالت میں ہوگی جب کہ اللہ کے علم میں نماز پڑھتا نہ ہوگا ۔مگر ہم بُرے کام کے امر کی وجہ سے ماخوذ ہو سکیں گے ۔اس سے معلوم ہوا کہ عمل کرنا اور امر معروف بجالانا ہر وقت اپنے وجوب پر باقی ہے ۔اگرچہ اُس کا نتیجہ خدا کے ارادہ کے موافق ظاہر ہو ۔کیونکہ ہر ایک قسم کا محو و اثبات نفس الامر میں اللہ کے علم کے مطابق ظاہر ہو رہا ہے اور بندے کو وقوع سے پہلے اُس کا علم نہیں ہوتا ۔پس بندے پر بلحاظ ادب و عبودیت کے واجب ہے کہ جس کام میں امر کی مخالفت ہو اُس سے توبہ و استغفار کرے اور جس میں اُس کے ارادہ کی موافقت ہو اس پر حمد و شکر بجا لائے اس تقریر کی حقیقت وہ سمجھ سکتا ہے جس نے رسول اللہ ؐ کے قول (کُلٌ میسّرٌ لما خلق لہٗ) کی حقیقت و منشا[1] سمجھا ہوا ہے ۔خوف و رجا بھی سالکوں کا ایک مقام ہے ۔لیکن عبد کامل اُن سے بھی آزاد ہوتا ہے ۔ہاں وہ خوف جو اللہ تعالیٰ کی جلالت و عظمت کو ظاہر کرتا ہے ۔اس خوف سے بری نہیں ہوتا ۔اور اس خوف میں ہر ایک انسان اپنے

---

[1] ہر یکسے وہی کام آسانی سے صادر ہوتا ہے جس کے واسطے وہ اللہ کے علم میں بنایا گیا ہے ۔

مرتبے و معرفت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اسی واسطے رسول اللہؐ اس اعتبار سے سب سے زیادہ خائف تھے۔ جیسا کہ انا اعرفکم باللہ و اخوفکم (میں تم سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ خائف ہوں) اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر وہ خوف جو عبد کامل کے دل پر نہیں گزرتا وہ خوف معلول ہے۔ یعنی عذاب و عقاب کا۔ اس خوف کے نہ ہونے سے وجہ یہ ہے کہ خوف معلول اہل حجاب کو ہوتا ہے اور عبد کامل اور اس کے آقا میں کوئی حجاب و پردہ نہیں ہوتا۔ اور اس کی کوئی مراد نہیں ہوتی بلکہ جو اس کے سید کا ارادہ ہو وہی اس کا ارادہ ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ایسا خوف کسی مکروہ و مصیبت کے خیال سے پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے خیال میں اس کو دفع کرنا چاہتا ہے گویا اللہ کے ارادہ پر غالب ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے ادبی ہے۔ اسی طرح رجار کا حال ہے وہ رجار جو اظہار ذلت و عبودیت و مسکنت کے واسطے ہو اس سے عبد کامل آزاد نہیں ہوتا۔ لیکن وہ رجار جو اس کی اپنی آرزو کے وقوع کے لئے ہو اس سے وہ کنارہ کش ہوتا ہے کیونکہ وہ حقیقت حال سے آگاہ ہوتا ہے اس لئے کسی چیز کی آرزو اس کے اندر نہیں ہوتی۔ گویا اس کے نزدیک بدنصیبی و محرومی و منع میں وہ حلاوت ہے جو حصول و عطا میں ہوتی ہے۔ ان باتوں کا راز ذوق و اس رستے پر چلنے سے کھلتا ہے۔ ایں راہ رفتن نہ راہ گفتن۔ علاوہ اس کے اپنی آرزو کے وقوع کی تلاش خدا کا مقابلہ ہے اور اس پر تحکم کرنا ہے جو سخت بے ادبی و گستاخی ہے۔ نیز اس میں نفس کی خوشنودی اور رعونت ہے اور اپنے آپ کو صاحب ارادہ اختیار سمجھتا ہے۔ حالانکہ عبد کا سید کے آگے کوئی ارادہ و اختیار نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ آیت ذیل سے ثابت ہوتا ہے ربک یخلق ما یشاء و یختار

ما کان لهم الخیرۃ (تیرا رب جو کچھ چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے پیدا کرتا ہے اُن کا اُس میں کچھ ارادہ واختیار نہیں ہوتا) پس جو یہ دعویٰ کرے کہ اُس کا بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارادہ و اختیار ہے۔ وہ مشرک ہے اور زبان حال سے مدعی ربوبیت ہے اگر زبان قال سے مدعی نہ ہو۔ کیونکہ جو چیز اللہ کی ہو اُس میں بندہ کا اشتراک نہیں ہونا چاہیئے جیسا کہ فرمایا (ما کانَ لهم الخیرۃُ) اور جو انسان کی طرف ارادہؐ واختیار منسوب کیا جاتا ہے وہ برائے نام ہے نہ حقیقتاً۔ پس انسانی ارادہؐ و اختیار اللہ کے ارادے و اختیار میں فنا و غرق ہے اور اس قسم کا ارادہ و اختیار اللہ تعالیٰ کی حجۃ بالغہ کے مقابلہ میں اعتراف و اقرار کے واسطے کچھ مغر دہارج نہیں اس مسئلہ کی حقانیت کا ہر ایک فرد رات و دن یقینی طور سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اُس پر قادر نہیں ہو سکتا اور وہ مثلاً کسی چیز کو کرنا نہیں چاہتا لیکن اسے مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص اس بدیہی مسئلہ میں بھی مکابرہ کرے وہ محسوس کا منکر ہے اور مرض جہل مرکب میں مبتلا ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے جاننا چاہیئے کہ کسی چیز کا ارادہ کرنا وہ ارادہ نہیں جو عابدوں کے نزدیک مذموم ہے کیونکہ اوامر کا بجالانا اور نواہی سے بچنا بغیر دلی ارادے کے نہیں ہو سکتا۔ پس کوئی فعل و حرکت بغیر مجبور کیئے گئے اور رعشہ والے کے بغیر ارادہ و اختیار کے صادر نہیں ہوتا۔ اگر انسان اس ارادہ فعلی سے عبودیت سے نکل جاتا تو سب افعال ارادیہ میں بھی انسانوں کے ارادے فسخ ہو جاتے۔ اور یہ جائز نہیں۔ فافہم فانہ دقیق مُنزلِقٌ۔

پھر جاننا چاہیئے کہ یہ مقولہ ارید ان لا ارید (میں ارادہ کرتا ہوں

کہ کوئی ارادہ نہ کروں) ادب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی ارادہ ہے۔ بلکہ ادب یہ مقولہ ہے اُرید ما ترید (جو تیرا ارادہ ہے وہی میرا ارادہ ہے) اور یہی حقیقت انسانی کا مقتضا ہے۔ گویا جس چیز کا ارادہ شرع کرتا ہے وہی اس کا ارادہ ہے اور وہ ارادہ شریعت ربانی کے ساتھ متصف ہے اس کے لئے کسی چیز میں کوئی غرض و غایت نہیں رہتی۔ کیونکہ تمام احکام شرعیہ اور امور ربانیہ میں عبد کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ عبد کا ارادہ اُسی کے ارادہ میں شامل اور اسی کے تابع ہوتا ہے اگر کوئی بے سمجھ ادراک حقیقت سے عاری یہ خیال کرے کہ اس حالت میں تو وظائف و اوراد و ادعیہ وغیرہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ کیونکہ ان میں بندے کی تمنائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں۔ اور تمہاری اس تقریر کے بموجب بندہ کی کوئی آرزو نہیں ہونی چاہیئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا شخص شارع کے ہی ارادہ و اختیار سے ایسی آرزوئیں کرتا ہے نہ اپنے اختیار و ارادے سے۔ شاید ابویزید رضؓ کے قول اُرید ان لا اُرید سے بھی وہی مراد ہوگی۔ کہ وہ لفظ اُرید کا شارع کے ارادہ کے مطابق کہتے ہوں گے فافہم و تامل عند المقام۔

سالکین کا ایک مقام دنیا و آخرت کے حظوظ کا ترک کرنا ہے۔ لیکن عبودیت کے درجہ میں یہ بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عبد کامل کے نزدیک اُن کا ترک کرنا اُس وقت ہو سکتا ہے۔ جب کہ عبد اور آقا میں حجاب ہو۔ جب حجاب نہ رہا اور گھونگھٹ اٹھ گیا تو تکلف کیسا اور زہد کیسا۔ علاوہ اس کے عبد تو اس مقام میں اپنے سید کے تصرفات کو دیکھتا ہے اور اُس کی عطا و منع و اخذ و ترک کا مشاہدہ کرتا ہے۔ بس

اُس کو نہیں معلوم ہوتا کہ کیا ترک کر رہا ہے اور کونسی چیز لے رہا ہے - جو سامنے آ گئی استعمال کر لی - نیز جو اس کی قسمت میں ہے اُس کا ترک کرنا صحیح نہیں ہے اور جو اُس کا نصیب نہیں ہے اس کے ترک کرنے کے کیا معنی - گویا زاہد کی قسمت میں یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر مطلوب کی تحصیل کی طرف راغب نہ ہووے اور ازل میں ہی اُس کی تقدیر میں ہوتا ہے کہ وہ معاش کی تنگیوں اور تکلیفوں سے بچ جاوے - تاہم خدا اس کی مدح کرتا ہے اور یہ اس کا فضل ہے نہ عدل جیسا کہ تمام نعمتیں اپنے فضل سے لوگوں کو عطا کرتا ہے -

اور راغب دنیا دار کی قسمت میں یہ ہوتا ہے کہ وہ فراخیٔ معاش اور دنیا کے دھندوں کا رہے پھر اس کی مذمت کرتا ہے اور یہ اس کا عدل ہے اس نکتہ کو عارف ہی جانتے ہیں اور جاہل مدح پرست ہو گئے اور حقیقت راز سے سُست ہو گئے - سچ ہے (لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجاً ؎) علاوہ اس کے جو کچھ زاہد دنیا کی نعمتوں کو ترک کرتا ہے - یہ ترک ہی نہیں ہے - کیونکہ دنیا و مافیہا اُس کی ملک نہیں ہے جس کو وہ ترک کرے فرضاً اگر دنیا کی چیزیں جن کو وہ ترک کرتا ہے اُس کی ہوتیں اور پھر اُن سے منہ موڑتا تو بھی اللہ کے نزدیک اس کی اتنی قدر نہ ہوتی جتنی کہ مچھر کے پر کی - پس ترکِ دنیا اللہ کے تقرب کا ذریعہ نہیں ہے - البتہ ظاہری صورت محمود معلوم ہوتی ہے - فافہم

یہ بھی یاد رہے کہ ہر ایک انسان کا زہد و ترک دنیا اُس کے مرتبے و مقام کے مطابق ہوتا ہے پس انبیاء اور ان کی وارثوں کا زہد ایسے امور میں

؎ ہر ایک کے لئے الگ ایک راستہ و طریقہ ہے -

جو ذوق سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اُن کی ہمت و اندازے و مرتبے و مقام کے مناسب ہوتا ہے ہم اُن کے مقامات کو نہیں سمجھ سکتے ہیں ۔ کیونکہ نبی و رسول کے مقامات کو نبی و رسول ہی سمجھ سکتا ہے اور ولی کے حالات و مدارج کو ولی ہی خیال کر سکتا ہے ۔ دوسرے لوگ جو اُن مراتب کے نہیں ہوتے وہ مرف اُن کے مقامات کے الفاظ ادا کر سکتے ہیں نہ اُن کی حقیقت ۔ سچ ہے [1] (وما منا الا له مقام معلوم ثم الی ربکم ترجعون) یاد رہے کہ تجارت و خرید و فروخت اور دنیا کے امور کا سرانجام کرنا علی وجہ الجائزہ زہد کے منافی نہیں ہے ۔ کیونکہ اُن کی دنیا بھی آخرت کے لئے ہوتی ہے اور اُن کی آخرت محض رب کے لئے ہوتی ہے ۔

صحابہؓ و سلف صالحین کی تجارت و خرید و فروخت اسی قسم کی تھی (رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله . وابتغوا من فضل الله) وغیرہ آیات میں اسی طرف اشارہ ہے (اُن لوگوں کو تجارت و خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی ۔ اللہ کے فضل کو تلاش کرو ۔ آیۃ (منكم من يريد الدنيا ومنكم من يريد الآخرة) (تم سے کوئی تو دنیا کا طالب ہے اور کوئی آخرت کا) مضمون اوّل کے منافی نہیں ہے ۔ کیونکہ یہاں دنیا سے وہ دُنیا مراد ہے جو آخرت کے بدلے طلب کی جائے ۔ اور آخرت سے مراد یہاں صرف جہاد کی فضیلت ہے جو محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہو نہ غنیمت و مال کے لئے ۔ پس صحابہؓ کے بھی مختلف مدارج ہیں ۔ کوئی فاضل تھے کوئی افضل ۔ کوئی کامل تھے کوئی اکمل ۔ پس زاہد و مجرد کو چاہیئے کہ دنیا داروں

---

[1] ہر ایک ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتا ہے ۔ پھر اپنے رب (اصلیت) کی طرف پھر جاتے ہیں ۔

اور دنیا کے امور بہم پہنچانے والوں پر اعتراض نہ کرے - کیونکہ وہ کسی امر کے مدعی نہیں ہوتے اپنے آپ کو ذلیل وحقیر خیال کرتے ہیں - اور مجردوں زاہدوں عارفوں عابدوں کی فضیلت تسلیم کرتے ہیں - اور برخلاف اس کے اکثر زاہدوں مفت خوروں پر تکبر و ریا و عُجب (خود پسندی) غالب ہوتا ہے اور خلقت کے سامنے اپنی عبادت و طاعت کو زینت دیتے ہیں تاکہ جاہل لوگ اُن کی خدمت کریں اور وہ مفت کے تر نوالے اُڑا دیں - باوجود اپنے ان عیوب کے وہ لوگوں کی مذمت کرتے ہیں - جب اُن کی تعظیم نہ کریں عیب لگاتے ہیں - جب اُن کی خدمت نہ کریں اور جب کسی سے اپنی حاجت طلب کریں اور وہ اسے پورا نہ کرے تو اپنے دل میں اس سے جلتے ہیں - گویا کہ عبادت کا اجر لوگوں سے طلب کرتے ہیں پس جو اُن کی خدمت کرے اُسے دوست رکھتے ہیں اور اپنی مجلس میں جگہ دیتے ہیں - اُس کی تعظیم و تکریم بجا لاتے ہیں اور جو خدمت نہ کرے اُس کے ساتھ برعکس معاملہ رکھتے ہیں - سالکین کے مقام سے ایک ورع بھی ہے یعنی جو چیز خدا سے غافل کرے اُس سے پرہیز کرے - لیکن عبد جس حال میں اس کا سید اسے رکھے خوش رہتا ہے اُس کے نزدیک اعلیٰ اور ادنیٰ مرتبہ مساوی ہے اور وہ ہر حال میں یکساں خدا کو اپنے ساتھ دیکھتا ہے - خدا کو دور سمجھنا حجاب کا باعث ہوتا ہے - علاوہ اس کے وہ جانتا ہے کہ بندہ ہر حالت (طاعت - معصیت - نیکی - بدی وغیرہ اگرچہ وہ کام امر و حکم کے مخالف ہی ہو) میں اُس کے ارادہ کا مطیع و فرمانبردار ہے - بلحاظ ارادے کے کوئی بھی عاصی نہیں ہے اسی واسطے عارفوں نے کہا ہے کہ نجات طاعت پر موقوف نہیں - بلکہ بغیر طاعت کے نجات زیادہ متوقع کیونکہ نجات اس کا فضل و احسان ہے اور اعمال تو محض دار آخرۃ

میں جزا رو ترقی درجات کے لئے ہیں ۔ جاننا چاہیئے کہ مومن گناہگار جب گناہ کرتا ہے تو اُس سے فارغ ہونے کے بعد پشیمان ہوتا ہے اور پشیمانی ہی توبہ ہے ۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے (الندم توبۃ) (پشیمانی توبہ ہے) اس کا پشیمان ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ گناہ کو گناہ سمجھتا ہے اور اُس کے گناہ ہونے پر ایمان رکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ امر الہٰی کی مخالفت کو مکروہ و ناپسندیدہ سمجھتا ہے اس تقریر سے معلوم ہوا کہ مومن عاصی نیک کام بھی کرتا ہے اور بُرا کام بھی ۔ انہ ایسے لوگوں کے حق میں (خلطوا عملاً صالحاً و آخر سیئاً)[1] آیا ہے ۔ نیک تو اس اعتبار سے کہ وہ گناہ کے گناہ ہونے پر ایمان رکھتا ہے ۔ پس یہ ایمان و اعتقاد نیک عمل ہے ۔ بُرا عمل اس اعتبار سے کہ وہ اس کا فاعل ہے ۔ جاننا چاہیئے کہ بندہ کی کیا مجال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی امر کی ظاہراً و باطناً بلا ارادہ سابقہ مخالفت کر سکے ۔ پس تمام مخلوق اگرچہ کوئی ان میں سے الوہیت کا دعوٰے کرے اسی کے ارادہ سابقہ و قضائے اول کے ماتحت ہے اور سب اس کے حکم کے تابع ہیں ۔ شکر و کفر سب اسی کے ارادہ سے ہیں اور حقیقت میں کوئی شخص اس کے ارادے سے باغی اور عاصی نہیں ہے اور خلقت کا گناہگار و مخالف کہلانا صرف امر ظاہر کے اعتبار سے ہے نہ حقیقت اور ارادہ سابق کے لحاظ سے ۔ پس جس سے وہ طاعت نہیں چاہتا ہے وہ مخالفت نہیں کر سکتا ۔ اور جس سے سرکشی و نافرمانی مطلوب ہوتی ہے اس سے طاعت ممکن نہیں ۔ لیکن باوجود اس علم کے ہم مکلف ہیں اور ہم کو مخالف ظاہری کے امر معروف

---

[1] وہ عمل نیک و بد کو ملا دیتے ہیں ۔

سے مخالفت کرنی چاہیئے - اور ہماری تلقین بھی اُسی کے ارادہ سے ہوتی ہے
کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وقت ہم منکر و گناہ ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی خاموش
رہتے ہیں اور اس کو منع نہیں کرتے - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم سے
سکوت و خاموشی چاہتا تھا - اور بعض وقت گناہوں سے روک تے ہیں اور
اس کو ڈانٹتے ہیں - اور خاموش نہیں رہ سکتے - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
ہمیں بلوانا چاہتا ہے - اسی واسطے ہم خاموش نہیں ہو سکتے یہ بدیہی بات ہے
پس بندہ ہر وقت تقدیر کے قبضہ میں ہے - لیکن اس کے حق میں عاجزی و
خاکساری سے ہی موصوف ہونا بہتر ہے اور ہر حال میں اپنی ذلت و تحقیر
کا اقرار کرنا ہی سعادتمندی ہے - یہ بھی یاد رہے کہ اللہ کا کمال و ارادہ
یہی ہے کہ اُس کے بندے گناہ و مخالفت کریں اور یہ عالم کے کمال کی جزا
ہے - اگر یہ جزا نہ ہو تو خدا کے فعل میں نقص آئے گا - اسی واسطے رسول اللہ ؐ
کا قول ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرو اور استغفار نہ مانگو تو اللہ تمہیں ہلاک کر دیگا
اور گناہگار قوم پیدا کرے گا - جو گناہ کریں گے اور بخشش مانگیں گے پھر
اللہ انہیں معاف کرے گا - اگرچہ معاصی و شرور اللہ کے ارادے سے ہوتے
ہیں - لیکن ادب کی وجہ سے اُس کی طرف منسوب نہیں کرتے کیونکہ اللہ نے
ان کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا - بلکہ بُرے کاموں کو شیطان کی طرف
منسوب کیا ہے - جیسا کہ فرماتا ہے (اِنَّ اللہ لا یامر بالفحشاء - اِنّ اللہ
لا یحب المفسدین[1]) بلکہ اُن کو شیطان کی طرف منسوب کر کے کہا ہے
(الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء[2]) اور یہ نسبت و اضافت

---

[1] اللہ بُرے کاموں کا حکم نہیں دیتا - اللہ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا -
[2] شیطان تم کو افلاس سے ڈراتا اور بُرے کاموں کی ترغیب دیتا ہے -

باعتبار فعل و ترغیب کے ہے نہ بلحاظ خلق و ایجاد کے۔ بلکہ خلق و ایجاد کے اعتبار سے تمام چیزیں اُسی کی طرف منسوب ہیں۔ جیسا کہ فرمایا (قل کل من عند اللہ فما لهؤلاء القوم لا یکادون یفقهون حدیثا۔ وما اصابك من حسنة فمن اللہ وما اصابك من سیئة فمن نفسك) (کہہ کہ ہر ایک چیز اللہ کی طرف سے ہے ان لوگوں کو کیا بلا مار گئی کہ کچھ نہیں سمجھتے۔ جو تجھے نیکی پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے) یہاں بھی بلحاظ خلق و ایجاد کے اپنی طرف نسبت کی ہے اور بلحاظ فعل و وقوع کے نفس کی طرف۔ فافہم۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ بُرے کاموں کو اپنے نفس کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں۔ اور نیک کو اپنے رب کی طرف تاکہ ادب ملحوظ رہے۔ خضر علیہ السلام نے عیب اپنی طرف منسوب کیا۔ اور کہا (فاردتُ ان اعیبها) (میں نے اُسے معیوب کرنا چاہا) اور حسن کو خدا کی طرف لگایا۔ اور کہا (فاراد ربك ان یبلغا اشدهما) (تیرے رب کا ارادہ ہے کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جاویں) ابراہیم علیہ السلام نے کہا (واذا مرضتُ فهو یشفین) جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ دیکھو مرض کو اپنی طرف منسوب کیا اور شفا کو خدا کی طرف اور یہ نہیں کہا (اذا امرضنی فهو یشفین) جب وہ مجھے مریض کرتا ہے تو شفا دیتا ہے۔ رسول اللہؐ نے کہا (الخیر کلہ بیدك والشر لیس الیك) تمام خوبیاں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں اور عیوب تیری طرف منسوب نہیں ہو سکتے) دیکھو باوجود اس کے کہ انبیاء جانتے تھے کہ خیر و شر کا خالق وہی۔ خیر کو تو اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شر کو از روئے ادب کے اُس کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ فافہم

یہ جو ہم نے بیان کیا ہے کہ معصیت کا وجود بھی خدا کا کمال ہے۔ اُس
کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح ہر کام میں اُس کا فضل معلوم ہوتا ہے اور پایا جاتا
ہے کہ باوجود کثرتِ عصیان و مخالفت کے وہ اپنی مخلوق پر بڑا مہربان اور
مشفق ہے۔ اگر سارے ہی مطیع و فرمانبردار ہوتے تو اس کے علم و فضل کا مظہر
کون ہوتا پس عاصی بھی اُس کے ارادے سے خارج نہیں ہیں۔ اسی واسطے
ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ مومن گنہگار طاعت و عبادت سے خالی نہیں
ہو سکتا ہے یعنی اللہ کے ارادۂ سابقہ کی موافقت طاعت و عبادت ہے
اگرچہ امرِ حکم کے اعتبار سے مخالفت معصیت ہے لیکن اہل اللہ سے
مطلقاً حق کی مخالفت نہیں ہوتی۔ جب اللہ اُن میں کوئی اپنا ارادہ سابقہ
پورا کرنا چاہتا ہے جس کے وقوع سے مخالفت امر ظاہری شریعت ثابت
ہوتا ہو تو اللہ اُن سے عقل سلب کر لیتا ہے تاکہ وہ مکلف نہ رہیں اور
ارادۂ سابقہ بھی پورا ہو جائے۔ اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ جب اللہ
تعالیٰ اہل اللہ میں اپنے ارادے و مشیت کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اُن کی
عقول سلب کرتا ہے۔ اور جب وہ پورا ہو چکتا ہے تو عقل کو واپس کر دیتا
ہے۔ یا کسی تاویل سے جس کو وہ حق سمجھتے ہیں اس عمل مخالف کو اُن کی نظروں
میں مزین کر دیتا ہے اور جب امر مقدر ہو چکتا ہے تو اُس وقت اُس کی خرابی بھی
ان پر ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کی مثال آدم علیہ السلام کی معصیت کے ذکر
میں آ چکی ہے وہاں تلاش کرنی چاہیئے۔ حاصل یہ ہے کہ راستہ عشق و طریق
ذوق بڑا کٹھن ہے۔ جاننا چاہیئے کہ ناقص سالکوں پر شہود فعل (یعنی ہر
ایک فعل کو اللہ کا فعل سمجھنا) کا غلبہ ہوتا ہے اُس وقت وہ کہتے ہیں کہ نہ کوئی
خدا کی طاعت کرتا ہے نہ معصیت۔ بلکہ جو کچھ نیکی و بدی ہوتی ہے سب

اُسی کا فعل ہے (الیہ یرجع الامر کلہ) کیونکہ وہ افعال عباد کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں اور بندوں کو ان کے اجرا کا محل لیکن گناہگاروں کو مواخذہ اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ صدورِ فعل کا آلہ ہیں اور وہ ان کے حق میں معصیت ہے اگرچہ ارادے کے اعتبار سے طاعت ہے اور جہال کی ہر ایک صورت کو صورت اعمال (جو شرع میں طاعت و معصیت کے نام سے موسوم ہے) خیال کرتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک حلال و حرام و طاعت و معصیت مساوی ہو جاتی ہے۔ میں بھی جب اس مقام پر پہنچا تھا تو یہ کیفیت مشاہدہ ہونے لگی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس درجے سے جلدی نکال لیا تھا اور شریعت کی حرام کردہ چیزوں سے بچا لیا۔ علاوہ اس کے مجھے اس علم نے مدد دی کہ میں جانتا تھا کہ شارع کے نزدیک طاعت و معصیت میں فرق ہے۔ اگرچہ سب کچھ فعل اسی کا ہے۔

اس درجہ میں اکثر وہ لوگ زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ جن کو اس تفرقہ کا علم نہیں ہوتا اور وہ ایسی نعمتوں میں اپنے آپ کو خیال کرتے ہیں۔ جن کے برابر کوئی نعمت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک نہ خوف رہتا ہے نہ رجا۔ لیکن عبدِ خالص وقوعِ افعال کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ کیونکہ اس حالت میں تکلیفِ شرعی باطل ہو جائے گی۔ حالانکہ امر و نواہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان مکلف ہے۔ علاوہ اس کے انسان کا خدا کا خلیفہ ہونا اس بات کی تائید کرتا ہے کہ وہ کسی کام کے واسطے بنایا گیا ہے اور اس سے محنت و مشقت لینا مطلوب ہے۔ اسی واسطے ہمارے بعض مشائخ نے کسی کسب و دستکاری و صنعت و حرفت وغیرہ کاموں کی تحصیل کے واسطے بہت تاکید کی ہے اور لوگوں کا کاسب دنیا و معیشت میں مصروف ہونا خدا کی

محبت والفت کے منافی اور ہمہ تن اس کی طرف مصروف ومشغول ہونے کے مخالف نہیں ہے۔ پس جو شخص حصول کسب کے مخالف ہیں۔ اُن کی دلیل کمزور وضعیف ہے کیونکہ قائلین کسب بھی رجوع الی اللہ سے منع نہیں کرتے۔ بلکہ مانعین کسب فطرۃ اللہ کی مخالفت کرتے ولا تبدیل لخلق اللہ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی) جس طرح عبد افعال محمودہ ومذمومہ کو من کل الوجوہ خدا کی طرف منسوب نہیں کرتا اسی طرح ان افعال کو من کل الوجوہ بندوں کی طرف بھی منسوب نہیں کرتا اس میں تمام اہل نقل واہل اللہ مشترک ہیں اور تمام انبیاءؑ کی شرائع اس حکم پر متفق ہیں۔ پس کوئی شریعت نہیں ہے کہ افعال کو ہر پہلو سے خدا کی طرف منسوب کرے یا اُن کو ہر حیثیت واعتبار سے مخلوق کی طرف لگادے۔ بلکہ مختلف اعتبار سے ہر دو طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اگر بندے کی طرف منسوب کئے جائیں تو اس کے لئے بھی اخبار الٰہیہ میں ایک وجہ وحیثیت ہوتی ہے اور انہیں اعتبارات مختلفہ کی وجہ سے انسان ایجاد وفعل میں خدا کا شریک نہیں ہوسکتا اسی واسطے معتزلہ جو افعال کا خالق بندے کو ہی جانتا ہے مشرک نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اس میں خدا کو شریک نہیں کرتے اور ازروئے عقل کے افعال کو بندوں ہی کی طرف منسوب کرتے۔ اُن کی بھی شریعت تائید وتصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ وہ خلق کے اعتبار سے کہتے ہیں۔ اہل کشف کے نزدیک یہی طریقہ قوی وپسندیدہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مسئلہ افعال محمودہ ومذمومہ خاص ایک جانب متضاف نہیں ہوسکتا بلکہ دو اعتبار سے ہر دو جانب (اللہ والنسان) منسوب ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ (ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی) سے ظاہر ہوتا ہے۔ پس جو شخص دو آنکھیں رکھتا

جب وہ ایک آنکھ سے تو یہ دیکھتا ہے کہ یہ فعل (رمی) اللہ کا ہے۔ اور
دوسری آنکھ سے دیکھتا ہے کہ یہ فعل عبد کا بھی ہے اور جو ایک آنکھ سے
دیکھتا ہے فقیر ہو یا غیر۔ وہ اعور (یک چشم) ہے۔ پس اس مسئلہ کی حقیقت
اہل کشف پر بخوبی منکشف ہے اور باقی لوگ ہمیشہ دنیا و آخرت میں
مختلف رہیں گے۔ پس مسائل الٰہیہ میں مسئلہ افعال محمودہ و مذمومہ نہایت
حیران کرنے والا ہے۔ جب یہ معلوم ہو چکا تو سمجھنا چاہیئے کہ اللہ کی حجت
ہر حال میں بندے پر قائم ہے اور اُس کی بات ہر حالت میں اوپر ہی ہے
کیونکہ محکوم ہمیشہ حاکم کے نیچے ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی بندہ یوں بھی کہہ اُٹھے
کہ جب تمام افعال تیرے ارادے سے ہوتے تھے میرا اس میں کیا قصور ہے
تو مجھے کیوں مواخذہ کرتا ہے۔ تو اللہ اسے کہے گا کہ جس حق سے میں نے
تجھ کو عدم سے وجود کا لباس پہنایا تھا اور تیرا اُس میں کوئی اختیار نہیں تھا
اُسی قدرت و حق سے میں تجھے مواخذہ کرتا ہوں۔ پس بندہ ساکت
ہو جائے گا اور اس کی دلیل باطل ہو جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ بندے
کے لئے ہر حال میں عجز و تقصیر کا اقرار کرنا اور اُس کی رضا پر راضی رہنا ہی اولیٰ و بہتر
ہے اس مقام کو غور سے ملاحظہ کرو کہ یہ مضمون کسی اور کتاب میں نہیں ملیگا۔

سالکین کے مقام سے ایک درجہ تبتل (یعنی ہر امر میں خدا کی طرف
جھک جانا اور لوگوں کی پرواہ نہ کرنا) کا ہے جس میں وہ ہر وقت اوراد و وظائف
میں لگا رہتا ہے اور اس کو ذریعۂ نجات و وسیلۂ فلاح خیال کرتا ہے اور اس
تبتل سے تقرب کامل حاصل ہوتا ہے اور خلوت و [illegible] سے قرب و وصال کا
حصول ہوتا ہے۔ لیکن عبد کامل کو نہ سکوت نہ حرکت میں نہ خلوت میں
نہ جلوت وغیرہ کسی حالت میں کوئی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

بما هو کائن[1] کے موافق کسی تدبیر کو کام میں نہیں لاتا۔ کیونکہ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے نہ اس کو پارسا کی پارسائی زیادہ کر سکتی ہے نہ بدکار کی بدکاری اسے گھٹا سکتی ہے۔ پس وہ اللہ کی خالصاً لوجہ اللہ بغیر کسی غرض و غایت کے عبادت کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے (فاعبد اللہ مخلصاً له الدین الا للہ الدین الخالص)[2] پس جب یہ معلوم ہو گیا تو یہ دعویٰ کرنا کہ ہم ما سوا اللہ سے الگ ہو کر خدا کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ محض جہالت ہے کیونکہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ جہان اللہ سے جدا ہے اور اللہ جہان سے جدا ہے اور اپنے وہم کے مطابق لوگوں سے خدا کی طرف بھاگتا ہے۔ اور باعث اس کا ذوق و عشق کے درجے تک نہ پہنچنا ہے۔ نیز یہ خیال کہ قرآن میں (ففروا الی اللہ) (اللہ کی طرف بھاگو) آیا ہے۔ بیشک یہ آیت قرآن میں ہے لیکن اس کے وہ معنے نہیں ہیں۔ جس محور سے مفہوم ہوتے ہیں کیونکہ بھاگنے کے واسطے مسافت چاہیئے اور اللہ تو ہمارے نفسوں سے بھی نزدیک ہے۔ اور وہ ایک ہی فاصلے سے ہر ایک کے ساتھ ہے۔ بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جہالت سے علم کی طرف بھاگو۔ پس خلقت سے بھاگنے والے کا حکم کام میں لائے ہوئے چھوارے کی طرح ہے۔ اور جو اس کے ساتھ مشغول ہے۔ اس کی مثال تازہ چھوارے کی طرح ہے۔

مقام سالکین سے ایک درجہ یہ بھی ہے کہ وہ مراقبہ کرتے ہیں۔ لیکن

---

[1] جو ہو، ہو چکا۔ [2] اللہ کے بغیر کسی علت و غرض کی عبادت کر۔ اللہ ایسی ہی خالص عبادت پسند کرتا ہے۔

عبد کامل مقام رویت تک پہنچا ہوا ہوتا ہے اور اپنے افعال کو اپنے آقا سے صادر ہوتے دیکھتا ہے۔ پھر مراقبہ کس چیز کا۔ نیز عبد سے مراقبہ (افعال کی نگرانی) کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اللہ اُس کے مراقبہ اور ہر چیز پر رقیب (محافظ) ہے۔ پس بندے کے حق میں تذلیل و تقصیر ہی بہتر ہے اگر اُسے درجۂ مراقبہ حاصل ہو جائے وہیں جم نہ جائے اور اگر حاصل نہ ہو تو تلاش نہ کرے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی بہتری کس کام میں ہے ؎

او مصلحت تو از بہتر داند

پس معلوم ہوا کہ جس کام میں خلوص و اخلاص نہ ہو اُس کا نہ کرنا کرنے سے اچھا ہے۔ جس بیداری میں فائدہ نہ ہو اُس سے سو رہنا بہتر ہے۔ ہاں اہل اللہ کی بیداری اصل بیداری ہے کہ وہ اس میں اپنے آقا کے تمام افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ باتیں ذوق کے متعلق ہیں۔ بغیر ذوق کے معلوم نہیں ہوتی۔ پس تسلیم بہتر ہے۔ اگر منکر تیرے ساتھ مجادلہ کریں تو کہدے اللہ اعلم۔ (اللہ خوب جانتا ہے ہر ایک حال کو) عبودیت کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ عبد رویت ذات میں ایسا مستغرق ہو جاتا ہے۔ کہ عبودیت سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے سوائے جلوۂ حق کے اُس کے باطن سے سب خیال محو ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اپنے آقا کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا دیکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اُس سے اُن نعمتوں کا معاوضہ احسان و شکر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ مفلس ہے اور اُس کے تمام افعال اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور جن آیات سے اعمال کا بدلہ ثابت ہوتا ہے۔ جیسا (جزاءً بما کنتم تعملون) (یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے) ان کو وہ محض فضل و مہر سمجھتا ہے یعنی اُس کے نزدیک افعال و اعمال کا اس کے ہاتھ سے سرزد ہونا بھی فضل و احسان

ہے اور ان کا نتیجہ و نجات بھی مہربانی و اکرام ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک اللہ کی بخشش کا مدار کسی علت و غایت پر نہیں ہے۔

سالکین کا ایک مقام استقامت بھی ہے۔ لیکن عبد کامل اس کا مدعی نہیں ہوتا ہے۔ جب کہ رسول اللہؐ کا قول ہے کہ (اشیبتنی سورۃ ھود) (مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے) کیونکہ اس میں استقامت کا حکم ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے (فاستقم کما امرت) حکم کے موافق استقامت اختیار کر۔ اور اگر عبد کامل کو استقامت کا درجہ حاصل ہو بھی جاتا ہے تو اس کو اپنے آقا کا احسان سمجھتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ استقامت کی علامت یہ ہے کہ دعوے چھوڑ دے خواہ اس میں صادق ہو یا کاذب ظاہر ہو یا باطن غرضکہ ہر قسم کا دعویٰ ترک کر دے۔

ایک درجہ توکل کا بھی سالکوں کے نزدیک مسلم ہے۔ لیکن عبد کامل کے نزدیک اس قسم کا توکل عام کے درجہ کے موافق ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب کہ کوئی چیز ہماری ذاتی نہیں اور ہم کسی چیز کے مالک نہیں تو اس کے سپرد کرنے اور توکل کے کیا معنی ہوئے۔ گویا عبد کامل کے نزدیک وہ توکل جو کسی غرض و غایت سے معلول ہو صحیح نہیں اس کے نزدیک توکل کے یہ معنی ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمیشہ ہی ہر ایک کام اللہ کے حوالہ ہے اور اس کے قبضہ تصرف و حیطۂ اختیار میں ہے اور ان کے یہ الفاظ (توکلنا علی اللہ۔ وکلنا امرنا الی اللہ) تعمیل حکم و امتثال امر کے واسطے ہوتے ہیں یعنی اس سے اپنی عبودیت و نقص و عجز کا اقرار کرتے ہیں نہ کہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک سمجھ کر پھر اس کی حفاظت کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں اور عوام کا توکل ان کی نظر میں سوء ادب ہے لیکن ان کے [illegible] کیونکہ

وہ اسی درجہ کے لائق ہیں ۔ اور اس سے اعلیٰ درجہ کے واسطے اس حالت
میں مخاطب و مکلف نہیں ہیں ۔ کیونکہ انہوں نے ابھی درجہ عبودیت کا
ذائقہ نہیں چکھا اس واسطے وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال و اسباب کے مالک
ہیں اور یہ خیال ان کو اللہ کے قول (اموالکم) سے پیدا ہوتا ہے ۔ وجہ
یہ کہ وہ اس اضافت کو ملک کی اضافت سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں ۔
کہ مال ہمارے ہیں ۔ حالانکہ یہ اضافت ایسی ہے جیسی کہ سراج الدابہ
(سواری کی زین) اور باب الدار (گھر کا دروازہ) ہیں ۔ دیکھو یہاں زین
سواری کی مالک نہیں ہے اور دروازہ گھر کا مالک نہیں ہے ۔ بلکہ یہ
ہر دو مملوک ہیں اور مالک تیرا ہے ایسے ہی انسان اور اس کا مال
و متاع سب کچھ مملوک ہے اور مالک خدا ہے ۔ نیز اس کی وجہ یہ
ہے کہ عوام عقل کی کمی کے سبب سے اپنے آپ کو خود مختار سمجھ کر مال
کے ناز میں آ گئے اور ادب کی لذت سے غافل ہو گئے اور آپ نے
آپ کو مالک جان کر خدا کو وکیل بنا لیا ۔ مگر ادب کا طریقہ اس ناز
و انبساط و اختیار سے اولیٰ ہے ۔ علاوہ اس کے جو شخص مال کے گھمنڈ
پر تقرب الی اللہ کا دعویٰ کرے وہ مقام تقریب اور درجہ قرب سے
ناواقف ہے کیونکہ مقربین کے نزدیک ادلال و ناز صحیح نہیں ہے متوکلین
سے پوچھا جائیگا کہ تم نے کیا چیز خدا کے حوالہ کی تھی اور کس چیز کا اختیار
اس کو دیا تھا ۔ اگر مال و اسباب کا امر و اختیار اس کے حوالہ کیا تھا تو
وہ پہلے ہی اُس کا تھا تم نے کیا دیا اور اگر تم نے اس بات کو سمجھ لیا تھا تو
تمہارا اس میں کچھ اختیار نہیں تھا اور پھر تم نے اس اختیار کو حوالہ کیا تو
اس کے بھی کچھ معنے نہیں تھے تو بتاؤ تم نے کس بات میں مجھ کو اپنا وکیل

بنایا تھا۔ فافہم ہذا المحل۔

سالکین کے مدارج سے تفویض بھی ہے یعنی اپنے جمیع حالات کو اللہ کے سپرد کرنا۔ لیکن عبد کامل کے نزدیک یہ بھی معلول ہے کیونکہ وہ تمام امور و اختیارات کو خدا کے ہاتھ میں دیکھتا ہے۔ پس تفویض کے کیا معنے ہوئے۔ حالانکہ ہر ایک امر ازل سے ہی اس کے اختیار و تحویل میں ہے۔ پس ان کا کام محض عجز و انکساری کا اقرار ہوتا ہے اور یہی منشار ہوتا ہے اُن کے اس قول کا (فوضنا امرنا الی اللہ) ہم عاجزی کا اقرار کرتے ہیں اور وہ حکم بجالانے کے واسطے عبادت کرتے ہیں اور اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ اس سے اُن کا مالک کا کیا ارادہ ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اُس کے تمام افعال عین حکمت ہیں معلل با اغراض نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر اس کے افعال کی کوئی علت غائی ہوتی تو محتاج ہوتا اور علت غائی و غرض و غایت کا محکوم ہوتا اور یہ خیال ذات حق کے حق میں محال ہے اسی واسطے عبد کامل اپنے افعال کے نتیجے کو نہیں دیکھتے۔ بیشک ہر ایک اپنی لیاقت و مقام کے موافق کلام کرتا ہے۔ ایک مقام سالکوں کا یہ ہے کہ وہ اسباب و وسائط کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن عبد کامل کے نزدیک حکمت الٰہی کے واسطے وسائط و ذرائع کا ہونا ضروری ہے اگرچہ وہ انہیں پر نہیں ٹھہرتے اور اُن کو مقصود بالذات تصور نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے ہر چیز کے واسطے ایک سبب بنایا ہے تو اُس کا ہونا بھی ضروری ہے اسی واسطے وہ ہر چیز کو اُس کے قاعدۂ و قانون کے موافق کرتے ہیں اور یہی ادب ہے اور یہی حکم ہے (واتوا البیوت من ابوابھا)[۱] عارفوں کا یہی

[۱] گھروں میں اُن کے دروازے سے ہو کر آؤ یعنی ہر چیز کو اُس کے قانون و قاعدہ کے موافق تلاش کرو۔

اصول ہے۔ لیکن عوام کی نظر صرف اسباب پر پڑتی ہے، اور مسبب کی طرف نہیں جاتی۔ غرض یہ کہ مسئلہ اسباب میں تین گروہ ہیں عوام تو محض اسباب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ سالک ناقص محض مسبب پر۔ عبد کامل و عارف اکمل اسباب و مسبب ہر دو کو اپنے اپنے محل پر ضروری خیال کرتے ہیں۔ ابتدا رحال میں جب میں اس گروہ میں شامل ہوا تو میری نظر اسباب پر نہیں پڑتی اگر کوئی شخص مجھے کچھ دیتا تھا تو اس کا احسان مند نہیں ہوتا تھا بلکہ خدا کا ہی احسان مانتا تھا۔ اگر کوئی شخص ایسے وقت میں جب کہ مجھے سخت بھوک لگی ہوتی یا نہایت زور کی پیاس ہوتی۔ میرے پاس کوئی لذیذ کھانا یا سرد پانی لاتا تو بھی اُس کا شکریہ نہ کرتا اور اس کے شکر بجالانے کو شرک سمجھتا۔ اور اُس حال میں دعا نہ مانگتا نہ اپنے لئے نہ غیر کے واسطے یہاں تک کہ نماز جنازہ میں بھی دعا نہ کرتا تھا نہ کسی کے واسطے کلمۂ شکر میری زبان سے نکلتا نہ کفر۔ اگر کوئی میرے ساتھ اس میں گفتگو کرتا اور ہزار دلائل پیش کرتا تو میں کوئی ایسی وجہ پیش کرتا جس سے وہ ساکت ہوجاتا۔ اور اپنے آپ کو حق بجانب خیال کرتا غرض یہ کہ ہر قسم کی وسائط کی میری نظر میں کچھ وقعت نہ رہی پھر کچھ مدت کے بعد اللہ نے مجھ کو اُس سے نجات دی اور اسباب و سائط کی حکمت سے واقف کیا۔ پس معلوم ہوا کہ عبد کامل اگرچہ مسبب پر اعتماد کرتا ہے مگر اسباب کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور اگرچہ لائق مدح و شکر مسبب ہی ہوتا ہے۔ مگر وہ امتثال امر کے واسطے سبب و وسیلے کی بھی شکر گزاری کرتا ہے دیکھو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اگرچہ بغیر قسمت ازلی کے کسی کو ہدایت نہیں کرسکتے اور کسی کو فیض نہیں پہنچا سکتے مگر وہ وسائط ہونے کی وجہ سے مطاع ہوتے ہیں کیونکہ انہیں کے ذریعہ سے ہمیں حسن قبیح کی شناخت

ہوتی ہے اور نیک و بد طریق کی پہچان ہوتی ہے۔ گویا وسائط چشمۂ جاری کی مانند ہیں اگرچہ حمد کے لائق چشمے کا جاری کرنے والا ہے۔ لیکن عارفوں کے نزدیک بلا جاننے وجہ کے وسیلہ کی شکر گزاری بھی اسی کا حکم ماننا ہے اور وجہ تلاش کرنی ان کے نزدیک بے ادبی ہے۔ اہل تسلیم ہونا بھی ایک درجہ ہے۔ مگر عوام کے لئے نہ عبد کامل کے واسطے۔ کیونکہ اصطلاح میں تسلیم کی تعریف یہ ہے کہ اپنی ہر ایک چیز کو خدا کے سپرد کرنا۔ حالانکہ یہ جہالت و دعویٰ ہے۔ کیونکہ انسان اپنے ظاہر و باطن وغیرہ میں کسی چیز کا جب اصلی مالک نہیں تو تسلیم کے کیا معنی۔ عبد کامل جب دیکھتا ہے کہ اُن کی ذات و صفات و تمام کائنات اللہ کے قبضے میں ہے جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے اور کوئی چیز اس کے قبضے سے خارج نہیں پاتے جس کو وہ اُس کے حوالے کریں تو اس خیال و دعویٰ ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ ہاں انبیاء کی تسلیم میں کلام نہیں ہے۔ لیکن یہ ایسے امور میں ہوتی ہیں جو غیر دل کے مذاق میں نہیں سماتی۔ علاوہ اس کے اُن کی صفات سب سے اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں جس میں کسی دوسرے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اہل صبر ہونا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن عبد کامل اس کا بھی مدعی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں یہ دعویٰ پایا جاتا ہے کہ وہ بلا و محنت کی برداشت کی قوت رکھتا ہے۔ حالانکہ خدا کے سوا کسی میں قوت نہیں (انّ القوۃ للّٰہ جمیعاً) ہر قسم کی طاقت خدا کے واسطے ہے۔ عارفان کامل جب ہر چیز میں اپنا عجز مشاہدہ کرتے ہیں تو ہر ایک شے کو اللہ کی طرف رد کر دیتے ہیں۔ اور صبر کے مدعی اشیاء کو اپنی طرف رد کرتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ ادب یہ ہے کہ عبد بلا کو بلا میں ڈالنے والے (خدا) کی طرف سے قبول کرے اور اُس کے فعل پر رضامندی ظاہر

کرے ۔ لیکن ہمیشہ اُس میں رہنا پسند نہ کرے بلکہ اُس کی شکایت اپنے رب کے سامنے کرے ۔ کیونکہ اس بلا میں رہنے سے دوسری بلا میں گرفتار ہو جائے گا اور وہ یہ کہ اُس کا نفس اللہ کے فعل (بلاء) کو مکروہ ناپسند جانیگا اور یہ زیادہ مصیبت ہے ۔ اسی واسطے بڑے بڑے اکابر سے دفع بلاء کی طلب ثابت ہے ۔ چنانچہ ایوب علیہ السلام نے کہا رب انی مسنی الضر (میرے رب اب تو مجھے تکلیف ہے) جو یہ کہتے ہیں کہ دفع بلاء کے لئے سوال نہیں کرنا چاہیئے ۔ اور شکایت کا لب نہیں کھولنا چاہیئے ۔ کیونکہ اس میں خدا پر اعتراض ہے ۔ غلط خیال ہے ۔ کیونکہ بلاء کے محسوس اور اُس کے اُسی وقت دفع نہ ہونے کی طلب رضامندی کے لئے کافی ہے ۔ لیکن مداومت شروط نہیں ہے کیونکہ نفس رنج والم سے کراہت کرتا ہے ۔ پس عبد کو چاہیئے کہ ہمیشہ بلا ؤ مصیبت میں رہنا پسند نہ کرے ۔ بلکہ اس کے زوال کے لئے دعا مانگے اور جاہلوں کی طرح یہ دعویٰ نہ کرے کہ ہم اہل تسلیم و تفویض ہیں اور اللہ کے فعل پر اعتراض نہیں کرتے ہیں ۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ بے ادبی ہے اور ایک قسم کا تکبر ہے جو قہر الٰہی کو بڑھاتا ہے گویا یہ دو جہالتیں ہیں ۔ علاوہ اس کے ہمیں ایسے موقع پر سوال کی تعلیم دی گئی ہے جیسا کہ فرمایا ۔ ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ (ہماری طاقت سے زیادہ ہم پر بوجھ نہ ڈال) سالکوں کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کی مقضی (قضا کی گئی ۔ دی گئی ۔ تقسیم کی گئی) پر ہر حال میں رہنا پسند کرتے ہیں ۔ لیکن عبد کامل اس کی قضا پر راضی رہتا ہے نہ مقضی پر ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لا یرضیٰ لعبادہ الکفر ۔ ان اللہ لا یأمرُ بالفحشاء ۔ اتقولون علی اللہ مالا تعلمون) علاوہ

اس کے مقتضی پر راضی ہونا ارادے کی فرع ہے۔ حالانکہ عبد ارادہ
واختتام کا مالک نہیں ہے۔ پس بندہ اس حال میں راضی ہوتا ہے جس
حال میں اُس کا مالک راضی ہو۔ اور وہ حالت قضا کی ہے نہ مقتضی کی
جیسا کہ ان اللہ لا یرضیٰ بعبادہ الکفر (اللہ اپنے بندوں کے لئے کفر
کی حالت پسند نہیں کرتا) سے ثابت ہوتا ہے۔ پس بندہ اللہ تعالیٰ اسے
ہر حالت میں راضی رہتا ہے۔ اگرچہ وہ حالت شرع کے اعتبار سے معصیت
ہی ہو۔ راضی تو اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ وہ حالت اللہ کا فعل ہے
اور اس سے توبہ واستغفار اس لحاظ سے کرتا ہے کہ وہ فعل اُس کے
ہاتھ سے اس کی اقتضا صورت علمیہ کے بموجب صادر ہوا ہے اور ظاہر
میں اللہ کے امر کے مخالف ہے۔ اسی واسطے بعض عارفوں نے کہا ہے
کہ بندے کو ان امور میں اور ایسے افعال ظاہرہ و باطنہ میں جو نواہی سے
تعلق رکھتے ہیں زندہ و باہوش ہونا چاہیئے اور ان تمام امور میں باعتبار
تسلیم قضا مردہ و بیخبر ہونا چاہیئے۔ جاننا چاہیئے کہ بندے کے واسطے
ادب یہ ہے کہ خدا کے کاموں میں اپنے ارادے سے دخل نہ دے اور
جو کچھ اُس نے ہمارے حق میں رنج و راحت مقدر کر دیا ہے اس پر راضی
رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہماری بہتری ہم سے اچھی جانتا ہے اس مقام
کے متعلق کچھ اسرار ہیں جو افشا کے لائق نہیں۔ بعض عارفوں نے
اپنی خواہش کے مطابق اپنی مصلحت کی استدعا کی تھی آواز آئی کہ جو کچھ
ہم نے تیرے واسطے پسند کیا ہے وہ اس سے اچھا ہے جس کو تو اپنے
واسطے پسند کرنا چاہتا ہے ہماری تقدیر و اندازہ کے ماتحت رہ۔
ابراہیم بن ادہم کا قول ہے کہ میں نے اللہ سے قیام لیل کا سوال کیا تین

دن ادائے فرائض سے ہی محروم ہوگیا۔ پھر آواز آئی کہ بندہ ہو آرام پا۔ جب ہم تجھے سُلائیں تو سو جا۔ جب اٹھائیں اٹھ کھڑا ہو۔ پس میں بندہ ہوگیا میرے نزدیک خواب و بیداری مساوی ہوگئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ جو کچھ میرے واسطے ہے وہ پہلے ہی اُس کے پاس ہے اور اسی میں میری بہتری ہے۔

میں نے بھی ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ مجھ پر معصیت غالب نہ ہو اُس کے بدلے مجھ پر معاصی کا پُل بندھ گیا یہاں تک کہ میں ڈر گیا کہ کہیں اسی حالت پر نہ مر جاؤں۔ پھر میں نے اپنے اختیار کو چھوڑ دیا اور یہ راز مجھ پر منکشف ہوگیا۔ پس جو شخص صوفیائے کرام کے مقام سے کوسوں دور ہے۔ حظوظِ نفسانی میں غرق ہے۔ درہم و دینار کا بندہ ہے اس کو ان پر اعتراض کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حالات ذوق و کشف سے علاقہ رکھتے ہیں اور جس کو ذوق سے کچھ بہرہ ہے وہی (قل رب زدنی علماً) (کہہ اے میرے رب میرا علم زیادہ کر) کی حقیقت سمجھ سکتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ ذلت و انکسار کے طریقے سے امورِ خیر کی زیادتی کا طالب ہونا عبودیت کے منافی نہیں۔ جیسا کہ موسیٰؑ نے کہا تھا کہ (رب انی بما انزلت الی من خیر فقیر) (اے میرے رب میں تیری نیکیوں اور مہربانیوں کا محتاج و طالب ہوں) اس سے معلوم ہوا کہ عبد کو اسی پر کفایت نہیں کرنی چاہیئے جو اُس کے پاس ہو بلکہ زیادتی کا طالب ہونا چاہیئے۔ تاکہ غناء کی حد تک نہ پہنچے اور عبودیت و فقر کے اندر محدود رہے۔ پس عبد ہر حال میں اُس کا محتاج ہے۔ چاہے یا نہ چاہے۔ اگر اختیاراً نہ مانگے گا تو اضطرار و جبراً سوال کرے گا۔ پس معلوم ہوا کہ طلب عبودیت کے منافی نہیں ہے۔ مقام صبر میں اس کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے وہاں دیکھنا چاہیئے۔ جاننا چاہیئے کہ

انسان فطرت میں ہر ایک چیز کا عالم نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر درجے و مرتبے میں سعادت و کمال و شقاوت و نقصان کا علم حاصل کرتا رہتا ہے اسی واسطے رسول اللہؐ کو حکم ہوا (قل رب زدنی علماً) اور فطرتی علم جو انسان میں ہے وہ صرف اتنا ہے کہ اللہ کی ہستی جانتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حادث قدیم کا محتاج ہوتا ہے۔ اس درجہ علم میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ فافہم ذالک۔

بارہا مذکور ہو چکا ہے کہ موسیٰؑ نے زیادتی کی طلب کی تھی لیکن ابراہیمؑ کے اس قول سے جو انہوں نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت جبریلؑ سے کہا تھا (حسبی من سوالی علمه بحالی) (مجھے سوال کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ میرے حال کو خوب جانتا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ طلب عبودیت کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام موقع و محل و مقتضائے حال کے موافق گفتگو کرتے ہیں۔ جہاں موقع سوال کا ہوتا ہے وہ سوال کر دیتے ہیں جہاں مقتضائے حال خاموشی ہوتی ہے وہاں خاموش رہتے ہیں اس اصول کے موافق ابراہیمؑ کا سوال نہ کرنا اس غرض سے تھا کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس موقع پر عدم طلب ہی ضروری ہے اور اس کا علم سابق ہی کافی ہے۔

اور موسیٰؑ نے یہ سمجھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد اس موقع پر اس سے اظہار فقر و فاقہ ہے۔ اس واسطے انہوں نے بھی مقتضائے وقت کے مطابق کلام کیا (ولکل وجهة هو مولیها)[1] ہر کسے را بہر کارے ساختند و میل آں اندر دلش انداختند۔ سالک غیر کامل یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خدا کی

---

[1] ہر ایک اپنے خیال کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔

نعمتوں پر شاکر ہے۔ گویا اس کی نعمتوں کا معاوضہ دے رہا ہے۔ لیکن عبد
کامل یہ دعویٰ نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے حقیقت خیال کرتا ہے
اور جانتا ہے کہ اُس کی کیا مجال و طاقت ہے کہ اپنے سید کی نعمتوں کی کسی
چیز سے مکافات کر سکے۔ حالانکہ اُس کی ہر چیز اسی کے خزانوں سے ملی ہے
(ان من شیئٍ الا عندنا خزائنہ) (ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں)
پھر کون سی چیز اُس کے عطیہ سے خارج ہے جس کو وہ مکافات کے طور پر
دے سکے اسی واسطے وہ کسی جدید نعمت یا دفع نعمت کے وقت اپنے نفس
کو یوں نہیں کہتا کہ آج تو اپنے سید کے احسان کے معاوضہ میں شب
بیدار رہ۔ کیونکہ وہ تو ہر وقت اسی کے خیال میں غرق ہوتے ہیں۔ اور
اُس کے ماسوا سے خبر نہیں رکھتے تو شکر کا خیال بھی ان کے خیال میں کیونکر
آسکتا ہے اُن کے نزدیک ما سوا اللہ کی طرف مشغول ہونا ضعف
ایمان و کمزوری عقل کی علامت ہے عبد کامل کا درجہ یہ بھی ہوتا ہے
کہ وہ اپنے افعال و احوال کو صادق نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک
اُن کا وجود ہی غیر مستقل اور جھوٹ ہے تو اُن کے افعال و احوال
کیونکر صادق ہو سکتے ہیں پس احسن عمل عبد خالص کا یہ ہوتا ہے کہ
وہ اپنے آپ کو گنہگار و جھوٹا خیال کرتا ہے کیونکہ وہ ظاہر کے اعتبار
سے اپنے آپ کو فاعل خیال کرتا ہے اور چونکہ ذات اُس کی باطل ہے
اس لئے اس کے اعمال و اوصاف بھی باطل ہوں گے) اور ایمان کی وجہ
سے اللہ کو فاعل خیال کرتا ہے۔ یہ خیال نہ کرنا کہ جس عمل کو وہ گناہ و باطل
خیال کرتا ہے وہ شرع میں بھی گناہ و باطل ہے۔ بلکہ یہ راز (حسنات
الابرار سیئات المقربین) کے قبیلہ سے ہے۔ ابرار کی نیکیاں مقربین

کے واسطے گناہ و بدیاں ہیں ۔ کیونکہ مقربین کا مقام یہ ہوتا ہے کہ افعال کو اپنی طرف منسوب نہ کریں اور کرلے پر مواخذہ ہو اور اگر کبھی اپنی طرف منسوب کرتے ہیں تو ادب کے واسطے نہ حقیقت کی رو سے اور ابرار کو اپنی طرف افعال منسوب کرنے سے مواخذہ نہیں ہوتا ۔ سالکین کے مقامات سے ایک مقام یہ بھی ہے کہ وہ ذات باری کی خاص معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ دعویٰ اکثر فقراء سے واقع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ میں نے بعضوں کو کہتے سنا کہ ہم ذات مقدسہ کو جانتے ہیں مگر یہ جہالت ہے ۔ اسی واسطے حدیث میں وارد ہے (لا تتفکروا فی ذات اللہ) اللہ کی ذات کو نہ سوچو) کیونکہ اگر تم اُس کی ذات کو سوچو گے تو اُس پر حکم لگاؤ گے کہ وہ ذات ایسی ہے حالانکہ اس کی حقیقت کا معلوم ہونا معلوم ۔ انسان صرف اسمار کو سمجھ سکتا ہے نہ حقیقت کو اسی واسطے رسول اللہؐ نے فرمایا ہے اللھم انی اسئلک بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک انزلتہ فی کتابک او علمتہ لاحد امن خلقک او استاثرت بہ فی علم الغیب عندک (اے اللہ میں تجھے اُن ناموں سے سوال کرتا ہوں جو تیرے لئے ہیں جو تو نے اپنے واسطے اختیار کئے ہیں اور ان کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا وہ نام جو تو نے کسی مخلوق کو سکھلائے ہیں یا جن کو تو نے اپنے علم غیب میں رکھا ہے) اسی واسطے عارف اُس کو زجر کرتے ہیں جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ ذات حق کو جانتا ہے ۔ ہاں عقل و تفکر سے صرف اُس کی ہستی ثابت ہوتی ہے نہ اُس کی ذات کی حقیقت یہاں تو عقل کے مرغ کے پر جلتے ہیں ۔ اور سوائے عاجزی کے کوئی علاج نہیں ۔ اسی واسطے ابو بکر صدیقؓ نے کہا ہے کہ العجز عن درک الادراک ادراک

ذات کے جاننے سے عاجز آنا ہی جاننا ہے) ایک مقام سلوک کا ایثار
بھی ہے یعنی یہ خیال کرنا کہ بندہ اپنی ہر چیز خدا کے واسطے قربان ونثار
کر دیتا ہے۔ لیکن عبد کامل یہ دعویٰ نہیں کرتا کیونکہ اس میں ملک کا
دعویٰ پایا جاتا ہے حالانکہ ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے بندہ کسی چیز کا مالک
نہیں ہے تو ایثار کیونکر متحقق ہو سکتا ہے اور خدا نے جو ایثار کرنیوالوں
کی تعریف کی ہے (ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ)
(اپنے نفسوں پر غیروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ آپ بھوکے ہی ہوں)
وہ محض اُس کا فعل ہے۔ اور ایثار نہ کرنے والوں کی مذمت محض عدل
ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہے کہ کریم کے ہاتھ سے لوگوں کو رزق
پہنچے۔ اور بخیل کے ہاتھ سے نہ پہنچے اگر اُس کے ہاتھ سے بھی پہنچنا مقدر
کرتا تو اُن کو پہنچتا۔ اگرچہ غصب اور سرقہ سے ہی ہوتا۔ لیکن ایک کی
اپنے فضل سے تعریف کر دی۔ اور دوسرے کی اپنے عدل سے مذمت
کر دی۔ کیونکہ اس کی شان ہے لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون
(جو کچھ وہ کرتا ہے اس کو کوئی نہیں پوچھ سکتا اور جو کچھ لوگ کرتے ہیں
وہ پوچھے جائیں گے) سلوک کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ سالک اپنے آپ
کو متخلق باخلاق حسنہ خیال کرتا ہے۔ لیکن عبد کامل کو بباعث شغل رویت
حق سے کسی اور چیز کی خبر نہیں ہوتی وہ اُس کی ذات میں محو و مستغرق رہنے
کی وجہ سے نیک و بد خلق و بد خلق میں تمیز نہیں کر سکتا۔ سلوک کا ایک
مقام یہ بھی ہے کہ سالک اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ انس والفت کرنے
والا دیکھتا ہے۔ لیکن عبد کامل اس سے بھی فارغ ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر
حال میں رویت حق میں مشغول ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ دعویٰ بڑا مشکل

ہے ۔ کیونکہ اوّل درجہ انس الٰہی کا یہ ہے کہ لوگ اگرچہ اس سے روگردانی
کریں ۔ مگر وہ ان سے منہ نہ موڑ لے ۔ نیز میں کہتا ہوں کہ لذت انس بھی حظوظ
نفس میں ہے ۔ پس عبد خالص وہ ہے کہ جس کے نزدیک انس و عدم
انس مساوی ہے علاوہ اس کے خدا سے کیونکر الفت کر سکتا ہے وہ
شخص جو اس کو ادراک نہیں کر سکتا ہے اور نہ اس کا ہمجنس و ہمشکل ہے
حالانکہ انس و الفت مانوس و مالوف سے ہو سکتی ہے اور با امر مفقود
ہے یہ راز ذوق سے علاقہ رکھتا ہے ۔ سالک قاصر کا ایک مقام یہ بھی
ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر حال میں ذاکر خیال کرتا ہے ۔ لیکن عبد کامل
کے نزدیک یہ دعویٰ بھی بڑا مشکل ہے کیونکہ حقیقت میں ذکر اسی وقت
ہو سکتا ہے جب کہ ذاکر اس کے مقابلہ میں ہر شے کو بھول جاوے ۔ علاوہ
اس کے ذکر میں تو ہر ایک چیز لگی ہوئی ہے ۔ تمام کائنات ذکر میں مصروف
ہے ۔ مگر اس کا معائنہ اہل کشف ہی کرتے ہیں ۔ میں نے بھی ایک دفعہ
یہ تماشہ مغرب سے لیکر ایک تہائی رات تک مشاہدہ کیا ۔ کیا دیکھتا ہوں
کہ تمام کائنات اونچی اونچی آوازوں سے تسبیح و تذکیر میں مصروف ہے ۔
میں ان کی آوازوں کو سنتا تھا ۔ اس حال کے مشاہدہ سے مجھ پر یہاں تک
خوف طاری ہوا کہ دیوانہ سا ہو گیا ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے
وہ نظارہ اٹھا لیا ۔ اس حالت میں میں نے مچھلی کو سنا کہ وہ کہتی تھی (سبحان
الملک القدوس رب الارزاق والاقوات والحیوانات والنباتات)
تمام کائنات میں سے صرف [illegible] تسبیح سمجھتا تھا ۔ پس جب
دیگر اشیاء بھی انسان کے [illegible] ہیں تو انسان
کے لئے ذکر باعث فخر کیونکر [illegible] خدا [illegible] اس

سے بھی زیادہ قریب ہے جتنی کہ نطق زبان سے تو انسان اُس کا ذکر کیونکر
کر سکتا ہے۔ کیونکہ یاد اُس کو کیا کرتے ہیں جو غائب ہو اور وہ تو سب سے
زیادہ نزدیک و حاضر ہے پھر اُس کا ذاکر ہونا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے نیز
ذاکر اس حالت میں ہو سکتا ہے جب کہ متخلق باخلاق اللہ ہو۔ کیونکہ
حدیث کی رو سے ذاکر اللہ کا جلیس ہوتا ہے۔ لیکن مدعی کا متخلق ہونا
مشکل کیونکہ اگر وہ اپنے دعویٰ میں صادق ہوتا تو اُس کے تمام افعال ظاہر
و باطن میں کتاب و سنت کے موافق ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی
ذکر تو محال ہے لیکن امتثال و فرمانبرداری کے واسطے کرنا چاہیئے۔ نہ
اُنس و تنزیہ وغیرہ خیالات کے واسطے کیونکہ اللہ تعالیٰ کمال مطلق
ہے اُس میں کسی وصف کی کمی نہیں جو تنزیہ وغیرہ حالات سے پوری
کی جائے۔ سالک قاصر کا ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ وہ
اسباب و وسائل سے منقطع ہو گیا ہے لیکن عبد کامل اس دعویٰ سے
خالی ہوتا ہے اور اُسے ان حالات و مقامات کی خبر نہیں ہوتی۔ کیونکہ
اسے ماسوا اللہ کی خبر ہی نہیں ہوتی تو دعویٰ کس چیز کا کرے۔

اور اگر وہ اسباب کی طرف ملتفت ہوتا ہے تو اس اعتبار سے
کہ وہ اُن میں اور اُن کے ساتھ اپنے آقا کو دیکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے
کہ تعیین اسباب و وضع وسائل میں بھی حکمت ہیں۔ گویا اس کا اسباب
کی طرف مائل ہونا عین ادب الٰہی ہے۔ لیکن ایسا مائل نہیں ہوتا کہ
بالکل اُن میں محو و منہمک ہو جائے اور مسبب سے منقطع وجدا ہو جائے۔

سالک ناقص کا ایک مقام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو موحد
خیال کرتا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو بندہ سمجھ کر اور اپنی ذات کو الگ خیال

کرکے ایک اور ذات کو لائق عبادت سمجھتا ہے۔ اس قسم کی توحید کو توحید الوہیت کہتے ہیں۔ لیکن عبد مخلص توحید ذات کے مقام پر پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ اس توحید میں ہر ایک قسم کی غیریت توحید ذات کے منافی ہوتی ہے صفات معنویہ و اوصاف کمالیہ جو خدا کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ توحید الوہیت کے منافی نہیں ہوتے۔ لیکن توحید ذات کے خلاف ہوتے ہیں۔ عبد کامل توحید ذات کے مرتبہ میں کوئی دوئی قائم نہیں کرتا۔ یعنی ایک ذات کے سوا اس کی نظر میں کوئی اور ذات نظر نہیں آتی۔ گویا وہ خود ہی خود ہے کیونکہ اسے بارگاہ ازلی میں کسی قسم کی غیریت و دوئی کو دخل نہیں ہے۔ توحید ذاتی کے اسرار بیشمار ہیں۔ جن کو اہل ذوق ہی سمجھتے ہیں مگر عوام کالانعام کے سامنے ظاہر نہیں کئے جاتے۔ کیونکہ اس درجہ پر پہنچنے والے اور اس حال کے جاننے والے اکثر فرائض و احکام شرعیہ کو ترک کر دیتے ہیں اور عوام کو ان کی ضرورت ہے۔ اگرچہ میں نے یہ بھی ذائقہ چکھا ہے۔ اور توحید ذاتی کے راز کو سمجھا ہے۔ مگر اللہ نے مجھ کو ترک فرائض وغیرہ احکام سے محفوظ رکھا۔ اور اس درجہ میں اس وجہ سے ترک فرائض کی نوبت آتی ہے کہ اس درجہ میں آمر (امر کرنے والا) و مامور (امر کیا ہوا) ایک ہو جاتے ہیں۔ جب جانب حق غالب ہو جاتی ہے تو احکام و فرائض سے فراغت ہو جاتی ہے۔ جب جانب عبودیت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ صادر ہونے لگتے ہیں۔ لیکن مجھ پر ہمیشہ جانب عبودیت غالب رہی اور میں امتثال اوامر اور اجتناب نواہی پر پابند رہا (فللہ الحمد فی السموات وفی الارض ولہ الحمد فی الاولیٰ والاخرۃ ولہ

الحکمۃ والیہ ترجعون) جب توحید ذاتی کا یہ حال ہے۔ اسی واسطے محقق عارف اُس ذات کو کسی لفظ سے تعبیر کرنے سے ساکت رہے ہیں حاصل یہ ہے کہ اس باب میں سوائے عشق و کشف کے خوض نہیں ہو سکتا اسی واسطے ہر ایک قسم کی عبادت و ہر ایک زبان اس کی تعریف و تعبیر سے قاصر ہے۔ کیونکہ الفاظ اور حافظہ اور عبارت اور معتبر سب حادث ہیں اور وہ ذات قدیم ہے۔ پس حادث قدیم کو کیونکر محیط ہو سکتا ہے۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ حق سبحانہ تعالےٰ اپنی اس توحید ہی سے جو اس کی صفت ہے منزہ و پاک ہے۔ نہ کسی کے پاک کرنے سے۔ اور اس توحید ذاتی کو جب تک عبد عبودیت و مخلوقیت کے درجہ میں ہے نہیں پا سکتا۔ نہ خالق کو ہماری عبادت کرنا اور اس سے اُس کا تقرب ڈھونڈھنا اور وہی امتثال شرع ہے نہ ازروئے تقرب ذات حق۔

وہ مقامات جن کا ذکر ہم اس رسالہ میں کرنا چاہتے تھے ختم ہو گئے اور جس نے ان اشاروں کو سمجھا ہو گا۔ وہ یقیناً نتیجہ نکالے گا۔ کہ جو کچھ عبد کامل پر ملکوت السموات والارض کے حالات منکشف ہوتے ہیں وہ بھی اسی کی طرح مخلوق ہی ہوتے ہیں نہ خالق گویا مخلوق مخلوق ہی کو دیکھتا ہے۔ اور کسی چیز کی حقیقت منکشف ہو جانے سے ذات حق کا انکشاف نہیں ہو جاتا۔ ہاں اُن چیزوں کے وجود سے معرفت ذات حق پر استدلال ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ شرعی طور سے امتثال اوامر و اجتناب نواہی میں قاصر ہو تو اُن چیزوں کے انکشاف سے اُسے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص بادشاہ کے مقربوں کے ساتھ اُس کے گھر میں داخل ہوا اور اس کے تمام اسباب و خزائن وغیرہ

کا مشاہدہ کریں۔ مگر وہ بادشاہ کے حکم کا ماننے والا نہ ہو تو اُس کو
بادشاہ کے خزائن و دفائن وغیرہ اسباب کے معلوم ہونے سے کچھ
فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ وہ غضب و عقوبت کے شکنجہ میں گرفتار ہوگا۔ چہ جائیکہ
کرامات و خوارق کا خواستگار ہو۔

علاوہ اس کے کرامات و خوارق کے بارے میں محققین کا خیال ہے
کہ جن چیزوں کا نام عوام الناس کرامت و خرق عادت رکھتے ہیں۔ اُن
کی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ وہ بھی ایک قسم کی ایجاد ہے جس کو اللہ تعالیٰ کسی
خاص وقت پر کسی خاص امر کے لئے ظاہر کرتا ہے جیسا کہ آیت ذیل
(بل ھم فی لبس من خلق جدید) سے ظاہر ہوتا ہے۔

پس اہل اللہ کے نزدیک بندہ کا حوادث زمانہ میں کوئی اثر
نہیں ہے۔ اور جو کچھ اُن پر اللہ کی طرف سے فیض ہوتا ہے وہ اُن
کی نظروں میں ایسا لائق وقعت نہیں ہوتا کہ اس کو حمد و ادب الٰہی پر
ترجیح ہو سکے۔ اسی واسطے ابو یزیدؒ نے کہا ہے کہ اگر قیامت کے روز
اللہ مجھے تمام مخلوق کی شفاعت کا درجہ عطا کرے تو میرے نزدیک
یہ بڑی عزت کی بات نہ ہوگی۔ اور میں اس کو بلحاظ شفاعت کے مہتم بالشان خیال
نہ کروں گا۔ بلکہ اس اعتبار سے عظیم الشان ہوگی کہ اس میں اپنے آقا کی حمد و
ثنا کرنی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کے لئے شفاعت کا مقام
محمود شفاعت کی وجہ سے عظیم الشان نہ ہوگا بلکہ اس اعتبار سے کہ اُس میں
حمد الٰہی کرنی پڑے گی۔ اور وہی مقصود بالذات ہوگی اور شفاعت مقصود
بالغرض۔ فافہم۔

اب میں چاہتا ہوں کہ اس رسالے کو ایک ایسے فقرے سے ختم کر ڈالوں

جو خلقت کے تمام احوال کا خلاصہ ہے۔ اور جمیع کتب الہامیہ منزلہ من اللہ کا لب لباب ہے۔ اور عارفوں کے مسلک کا ماحصل ہے۔

وہ یہ ہے کہ خواب میں میرے پاس ہاتف آیا۔ اور کہا کہ یہ کلام جامع حق سے میں نے کہا وہ کیا ہے۔ کہا کہ بندہ کا کچھ اختیار نہیں ہے۔ کہ مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا ترک کرنے کا دعویٰ کرے۔ اس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کہے کہ میں فلاں کام کروں گا۔ اس کا فرض صرف یہ ہے کہ جو کام اس کے ہاتھ ہم کروائیں اس کا حق بجا لائے۔ یعنی اگر نیک کام ہو تو اس پر ہماری تعریف کرے اور اس میں کوتاہی کرنے سے استغفار کرے۔ اور اگر برا و گناہ کا کام ہو تو بھی ہماری تعریف کرے اس اعتبار سے کہ ہم نے ہی اس کے واسطے یہ اندازہ کیا تھا۔ اور استغفار کرے اس اعتبار سے کہ وہ کام ظاہر میں ہمارے حکم کے خلاف ہے۔ اگرچہ غفلت اور سہو سے ہی ہو۔ غرض کہ ہر ایک کام میں جو اس کے ہاتھ سے صادر ہوتا ہے۔ ادب کا طریق اختیار کرے کہ (التصوف کلہ ادب) ہے اور تصوف کی بنا ادب پر ہی ہے۔ از خدا خواہیم توفیق ادب۔ بے ادب محروم ماند از فضل رب ؎ ادب تاجیست از لطف الٰہی۔ بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی۔ غرض کہ اس کتاب کا اصلی مدعا ادب و تعظیم الٰہی ہے اور بس۔

نہیں ہے صوفیوں کیواسطے اس سے کتاب اچھی — کہ ہو لیوں جامع تفسیر و استفسار قدسیہ

گئے شیخ عبدِ وہاب اسکو کر تصنیف عربی میں — جو تھے اک عارف حق قدوۂ ابرار قدسیہ

مگر اب چونکہ اکثر شائقین ادنیٰ لیاقت کے — سمجھ سکتے نہیں اس طرح کے آثار قدسیہ

تو شیخ عبدِ رحماں جس نے تفسیر کبیر اوّل — کرائی ترجمہ شائع کئے اسرار قدسیہ

اُنہیں کی کوششوں سے ہوگئی یہ بھی مترجم اب — کہ ہے عمدہ کتاب اور جامع اخبار قدسیہ

سعید زار اس کے سال کو جوں سوچتا ہی تھا — یکایک بول اُٹھا ہاتفِ اذکار قدسیہ

کہو تاریخ طبعِ ترجمہ بھی ہے ۔ فروغ آنہ — کہ جیسے نام نامی اُس کا ہے انوار قدسیہ
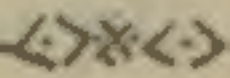
۱۳۲۴ھ

دینی کتب

معراج المومنین	صوفی عابد میاں صاحب ڈاھیلی	1-50
رسول کی باتیں	مولانا احمد سعید دہلوی	2-50
عرش الہی کا سایہ	″ ″	1-00
ہماری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟	″ ″ ″	1-25
تعلیم الاسلام مکمل چار حصہ مجلد	مفتی کفایت اللہ دہلوی	2-50
فضائل قرآن مجید	مولانا ذکریا صاحب	1-00
″ نماز	″ ″	1-00
بخاری شریف کامل تین جلدیں	مرزا حیرت دہلوی	30-00
مسلم شریف بمع عربی متن کامل تین جلدیں		45-00
بخاری شریف بمع ″ ″ ″		45-00
مشکوٰۃ شریف کامل دو جلدیں		18-00
مشکوٰۃ شریف بمع عربی متن کامل تین جلدیں		28-00

ان کے علاوہ ہر قسم کی مذہبی کتابوں کے لئے ہمیں لکھیں

صفیہ اکیڈمی ۶۱۴/۲ پی۔ آئی۔ بی کالونی ۲ کراچی ۵

۹